جلد ۸۶ | دسمبر ۱۹۷۶ء | عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	دسمبر ۱۹۷۶ء مطابق ذوالحجۃ ۱۳۹۶ھ	جلد ۸۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ۔۔۔۔ ۱۱۰۱۶/۴ ۔۔۔۔ ۱۱۰۱۷/۴

زرِ سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

چار ماہ کی جبری غیر حاضری کے بعد، جس کی وجہ میری علالت تھی، شافیٔ مطلق کی کرم فرمائی سے میں پھر قارئین ترجمان القرآن کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اِس عرصہ میں بزرگوں اور دوستوں نے جس ایثار اور محبت کا ثبوت دیا، خصوصاً مخدومی ملک غلام علی صاحب کے لوٹ کے بعد میرے کرم فرماؤں نے جس ہمدردی کا اظہار فرمایا اور مشفق معالجین نے جس دلسوزی کے ساتھ علاج معالجہ کیا آج کے مادّی دَور میں اِس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ مَیں اپنے سارے ہی خواہوں کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ اللہ رب العزت ان سب کو جزائے خیر دے اور خاکسار کو دینِ حق کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ہمارے مُلک کے وزیرِ اعظم اپنی ذات کو غیر معمولی طور پر نمایاں کرنے کے لیے جہاں بے شمار سطحی اور نمائشی کام کرنے میں مصروف رہتے ہیں، وہاں چند بے معنی مگر دلفریب نعرے بھی فضا میں بلند کرتے رہتے ہیں۔ ان نعروں میں ایک نعرہ "تیسری دنیا کا اتحاد" ہے۔ اِس نعرہ کی مدد سے وہ بین الاقوامی سطح پر اپنا قد کاٹھ بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو لوگ اس نعرہ کے پَس منظر سے واقف ہیں وہ اِس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اِسے ماضی میں مغربی طاقتوں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر بطور ایک شوشہ دُنیا میں چھوڑا تاکہ دُنیائے اسلام کا ردّ عمل معلوم کیا جا سکے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب دُنیا کی تعمیرِ نو کا سوال پیدا ہوا تو مختلف ممالک دو واضح گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ جو اشتراکیت کے علمبردار تھے یا جن کے مفادات کسی نہ کسی طرح اُن سے وابستہ تھے۔ دوسرے

وہ جو جمہوریت کا دم بھرتے تھے اور آزاد معیشت کو اپنی اقتصادی پالیسی کا سنگِ بنیاد سمجھتے تھے۔ اِن دو متحارب دھڑوں کے درمیان ایک تیسری طاقت اسلامی نظامِ حیات کی علمبردار کی حیثیت سے اُبھر رہی تھی اور اِس بات کا قوی امکان پیدا ہو چکا تھا کہ مستقبل قریب میں ایک نیا بلاک اسلام کی نظریاتی بنیادوں پر معرضِ وجود میں آ جائے گا جو اشتراکیت اور سرمایہ داری سے ستائی ہوئی مخلوق کے دُکھوں کا مداوا کرے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوگا۔ چونکہ اِسلامی نظامِ حیات اشتراکیت کی بے رحم جکڑبندیوں اور سرمایہ دارانہ نظام کی انسانیت سوز ریشہ دوانیوں کے درمیان ایک راہ اعتدال ہے، اس لیے مغربی ممالک کو اِس بات کی تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں اشتراکیت اور سرمایہ داری کے لگائے ہوئے زخموں سے چُور انسانیت اسلام کو اپنے لیے مرہم سمجھتے ہوئے دین کی اساس پر کسی نئی شیرازہ بندی کی طرف متوجہ نہ ہو جائے جو آگے چل کر مغربی تہذیب و تمدّن کے لیے کسی خطرے کا باعث بنے۔

اہلِ مغرب کے سامنے اسلام کی شکل میں جو مختلف خطرات منڈلا رہے تھے، اُن کے تدارک کے لیے اُن کے نزدیک سب سے اہم سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی اجتماعیت کی خاطر اسلام کے علاوہ کوئی دوسری بنیاد کیا فراہم کی جائے؟ اِس کام کے لیے اُن کے سامنے وطن کی اساس موجود تھی اور اس بنیاد پر یورپ کے متعدد معاشرے تشکیل پا چکے تھے۔ خود مسلمان ممالک میں وطنی قومیت کی تحریکیں چل رہی تھیں، لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ مسلمانوں میں جب بین الاقوامی حیثیت سے ایک نئی قوت کے وجود کا شعور پیدا ہوا اُس وقت وطنی قومیت کی تحریکیں دم توڑ چکی تھیں اور دُنیا کی ساری قوموں میں یہ احساس انگڑائی لے رہا تھا کہ انسان جس وطن سے تعلق رکھتے ہیں انہیں اگرچہ اس سے محبت تو ہوتی ہے، لیکن خاکِ وطن ان کی اجتماعیت کے لیے کسی اعتبار سے بھی اکسیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لیے اُنہیں کسی وسیع تر بنیاد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ یورپی قومیں جو نیشنلزم پر ایمان رکھتی تھیں اور جنہوں نے وطن میں شانِ الوہیت پیدا کر رکھی تھی، اُن کے افکار و معتقدات متزلزل ہونے لگے اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ قومی شیرازہ بندی کے لیے یہ بنیاد بڑی کمزور ہے۔

دَورِ جدید میں پیغام رسانی کے ذرائع اور حمل و نقل کے وسائل میں حیرت انگیز ترقی نے دنیا کے دُور دراز

گوشوں کو سمیٹ کر انسانوں کو ایک دوسرے کے اِس قدر قریب کر دیا تھا کہ اب اُن کے لیے چھوٹے چھوٹے دھڑوں میں بٹ کر زندہ رہنا اور اپنی قوتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ بدلے ہوئے حالات میں اِس بات پر مجبور تھیں کہ رنگ، نسل اور وطن کی بنیاد پر اپنی اجتماعیت کا قصر تعمیر کرنے کے بجائے کسی بلند تر نصب العین کی اساس پر اپنی شیرازہ بندی کریں۔ چنانچہ وہ مسلم ممالک جن میں وطن پرستی کی تحریک زوروں پر تھی اور جن میں لوگ "وطن پہلے اور مذہب بعد میں" کا نعرہ بلند کرتے تھے، وہ بھی اپنے اِس موقف پر قائم نہ رہ سکے اور اِس بات پر مجبور ہوئے کہ وطن کے بجائے اتحاد و اتفاق کے لیے کوئی دوسری بنیاد تلاش کریں۔

وطنیت کا طلسم ٹوٹنے کے بعد مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے لیے تو یہ سوال واقعی پریشان کن تھا کہ اگر خاکِ وطن اُن کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے سے جوڑ کر انہیں ایک اجتماعی قوت میں ڈھالنے سے قاصر ہے، تو پھر اُن کے اندر ربط و ضبط پیدا کرنے کے لیے کوئی دوسری مقناطیسی قوت کہاں سے فراہم کی جائے؟ اہل یورپ جس فلسفۂ حیات پر ایمان لاچکے تھے اُس کا تانا بانا چونکہ مادیت سے تیار کیا گیا تھا، اِس بناء پر اُن کے لیے اپنی اجتماعیت کے لیے مادی بنیاد کو چھوڑ کر کوئی دوسری بنیاد تلاش کرنا بالکل ممکن نہ تھا، خصوصاً ایسے حالات میں جب مادی تہذیب و تمدن کی علمبردار قومیں دُنیا میں طاقت ور اور سربلند بھی تھیں۔ چنانچہ حالات کے تُند و تیز دھارے نے اگرچہ وطنیت پر سے اُن کے ایمان کو متزلزل کر دیا لیکن انہوں نے وطن کے بجائے اجتماعیت کے لیے جو دوسری اساس یعنی دُنیوی مُفادات کا اشتراک، فراہم کی وہ بلاشبہ وسیع تر تو تھی مگر اُس کی نوعیت بھی سراسر مادی ہی تھی۔ لہٰذا دُنیا کے مختلف ممالک دو معاشی نظاموں کی بُنیاد پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر جب مسلم ممالک میں دیگر اقوام کی طرح وطنیت کا نشہ کافور ہوا تو وہاں کے باشندے اجتماعیت کی کوئی مادی اساس تلاش کرنے کے بجائے اسلام کی اُس رُوحانی بنیاد کی طرف متوجہ ہوئے جس کی بدولت وہ صدیوں تک رنگ، نسل، وطن اور زبان کے اتفاقی امتیازات کے باوجود ایک اُمت کی حیثیت سے دُنیا میں سربلند رہے اور جس کی تابندہ روایات اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے

تھیں - پھر مادی فلسفۂ حیات کی تباہ کاریاں بھی کھل کر اُن کے سامنے آ چکی تھیں - اشتراکیت اور جمہوریت کے دعویداروں نے انسانیت پر بالعموم اور اپنے زیرِ اثر ممالک پر بالخصوص جو مظالم ڈھائے تھے اُن سے پوری دنیا آشنا ہو چکی تھی - اِن حالات میں اِس بات کا کوئی امکان باقی نہ تھا کہ مسلمان اِن دونوں نظاموں کے ناکام تجربات کے بعد اور نوعِ انسانی کی المناک بربادی دیکھ کر بھی اپنی تعمیرِ نو کے لیے اِن دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ہی کر بیٹھتے - چنانچہ ان کے اندر رجوع الی الاسلام کا نہ صرف رجحان نمودار ہوا بلکہ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ایک تحریک پوری قوت سے ابھرنے لگی اور دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان آباد تھے اُن کے اندر یہ چبھتا ہوا احساس پرورش پانے لگا کہ ہم وہ بدنصیب لوگ ہیں جو وحدت اور اُخوت کی ایک مضبوط بنیاد رکھنے کے باوجود انتشار کا شکار ہیں اور تعلیماتِ الٰہی کے امین ہوتے ہوئے بھی کفر و الحاد میں اپنی فلاح ڈھونڈ رہے ہیں - وہ حیات آفرین نظامِ فکر و عمل جو ہمیں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ملا ہے اُسے چھوڑ کر ہم نے خدا کے غضب کو دعوت دی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں - خداوند تعالیٰ نے ہمیں ہر قسم کے قدرتی وسائل سے نوازا ہے لیکن ہم اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے در در کی بھیک مانگ رہے ہیں - اپنے تحفظ کے لیے کبھی امریکہ کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی روس سے امداد طلب کرتے ہیں - آخر کیا وجہ ہے کہ جس ملت کے ہاتھ میں سات آٹھ سو سال دنیا کی زمامِ کار رہی تھی وہ اِس قدر کمزور اور بے بس ہو جائے کہ اپنی آزادی کی بھی حفاظت نہ کر سکے بلکہ اپنی بقا کے لیے دوسروں کی دست نگر ہو؟ اِس قسم کے احساسات نے مسلمانوں کے اندر اسلام کو صدق دل سے اپنا کر اُس کے متعین کردہ خطوط پر جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا کیا - چنانچہ دنیا کے متعدد ممالک کے اندر مختلف ناموں کے ساتھ احیائے دین کی تحریکات زور پکڑنے لگیں - اسلام سے مسلمانوں کی از سرِ نو وابستگی کفر آخر کس طرح گوارا کر سکتا تھا؟ اِس لیے اُس نے سُرخ اور سفید سامراج کی چیرہ دستیوں کی شکار نوعِ بشری کے سامنے تیسری دنیا کا تصور پیش کیا - اِس تیسری دنیا سے اُن کی مراد یہ ہے کہ وہ ممالک جو معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہیں اور جن کے وسائل کا ترقی یافتہ قومیں عرصہ دراز سے استحصال کر رہی ہیں، انہیں ایک نئی قوت بنا کر نہ صرف استحصال سے بچایا جائے بلکہ معاشی لحاظ سے مضبوط بنایا جائے تاکہ دنیا میں دولت کے عدم توازن کی وجہ سے جو سنگین مسائل پیدا ہو چکے ہیں وہ بطریقِ احسن حل ہوں اور انسانیت آرام اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکے - جن لوگوں نے تیسری دنیا کا نعرہ بلند کیا ہے انہیں اس بات کی توقع ہے کہ معاشی مفادات

کا اشتراک مختلف قوموں کے درمیان اتحاد کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کر سکے گا۔

ممکن ہے کہ تیسری دنیا کا نعرہ بعض لوگوں کے سیاسی مفادات کے لیے کسی حد تک کار آمد ہو یا غیر مسلم قوموں کے لیے اِس بنا پر خوش آئند ہو کہ یہ مسلمانوں کے اسلام کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کا باعث بنے گا یا اس سے دنیائے اسلام میں فکری انتشار پیدا ہوگا اور مسلمانوں کی منزل کھوٹی ہوگی۔ یہ سارے مقاصد جن کی نوعیت سراسر منفی ہے قوموں کے درمیان رشتۂ اخوت استوار نہیں کر سکتے۔ جب بھی مختلف ممالک کے درمیان مادی مفادات کے تحفّظ کا سوال پیدا ہوگا تو اُن میں سے ہر ایک اس نہج پر سوچے گا کہ اِس تحفّظ سے اسے کس قدر مالی فوائد حاصل ہوں گے اور استحصال سے بچنے کے لیے اسے جو قربانی دینا پڑے گی اُسے اِس کا کیا صلہ ملے گا؟ مادی مفادات کسی پائدار اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتے کیونکہ اُن کے بطن میں تشتّت وافتراق کے جراثیم ہوتے ہیں۔ جب لوگوں کو یہ کہا جاتا ہے کہ آؤ مل کر اپنے معاشی مفادات کا تحفظ کریں تو اس دعوت میں یہ بات بھی مضمر ہوتی ہے کہ انہیں اِس تحفظ کے نتیجہ میں پہلے سے کہیں زیادہ دُنیوی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اِس توقع کی بنیاد پر ہر فرد یا گروہ اپنے حصّے کا بڑے جارحانہ انداز میں مطالبہ کرنے لگتا ہے۔ اِس طرح مادی مفادات کا اشتراک سیاسی انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ کیا روس اور چین دونوں اشتراکیت کے حلقہ بگوش ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ہم عنان ہیں اور ملکی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر اشتراکی نظام کی عملداری کے لیے کوشاں ہیں؟ کیا مشرقی یورپ میں اشتراکیت کے تسلّط نے روس اور اس کے مفادات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا ہے؟ کیا امریکہ، برطانیہ اور فرانس ایک ہی نظام کے علمبردار ہونے کی بنا پر ایک دوسرے سے متحد و متفق ہیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ معاشی استحصال کی روک تھام کی آڑ میں دنیا کے طاقتور ممالک پہلے تو کمزور اقوام کو زیرِ دام لاتے ہیں اور پھر اُن کے وسائل سے ناجائز انتفاع شروع کر دیتے ہیں۔ ستم زدوں پر جب عرصۂ حیات تنگ ہونے لگتا ہے تو اُن کے دلوں میں اپنے ان ”محسنوں“ کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور وہ اس امر کے لیے کوشاں ہوتے ہیں کہ کسی طرح ان ”کرم فرماؤں“ کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنا ”دستِ شفقت“ ان بے بسوں پر سے اُٹھا لیں اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ بھارت نے مشرقی پاکستان کو استحصال سے نجات دلانے کے لیے جس طرح مغربی پاکستان کے خلاف بھڑکایا اور پھر بنگلہ دیش میں لوٹ کھسوٹ کا جو بازار گرم کیا اور اس کے خلاف وہاں کے باشندوں میں جو شدید ردّعمل

پیدا ہوا اور اس سے جو خوفناک نتائج برآمد ہوئے اس سے پوری طرح دُنیا واقف ہے۔ چنانچہ جن ممالک میں بھی معاشی مفادات کی تحریکات نے زور پکڑا اور جن لوگوں نے ان کے تحفّظ کی غرض سے وطنیت سے ہٹ کر اتحاد کی کوئی وسیع تر بنیاد تلاش کی انہیں بالآخر اس اتحاد کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر کے جارحانہ قوم پرستی کا مسلک اختیار کرنا پڑا۔

دُنیا کے سارے ممالک کے معاشی مفادات ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ اُن میں سے دو تین کو بھی ایک سطح پر منظم نہیں کیا جا سکتا۔ اِس وقت جن ممالک کو "تیسری دنیا" کے نام سے متحد کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اُن میں ایک سو سترہ قومیں شامل ہیں۔ اُن میں پچاس قومیں اتنی مفلوک الحال ہیں کہ اُنہیں چوتھی دُنیا کا نام دیا جاتا ہے۔ بارہ قومیں تیل کے ذخائر رکھنے کی وجہ سے بہت امیر ہیں لیکن صنعتی اعتبار سے بہت پس ماندہ ہیں۔ ان دونوں کے درمیان پنتالیس قومیں ایسی ہیں جو بہترین مساعی کے باوجود موجودہ ظالمانہ معاشی نظام سے بے حد متاثر ہیں اور اِس کی وجہ اُن قوموں پر استعمار پسندوں کا بالواسطہ اور بلا واسطہ تسلّط ہے۔ اِن حالات میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان لاتعداد قوموں کے مابین صرف معاشی مفادات کی اساس پر کوئی ایسا اتحاد معرضِ عمل میں آئے جس سے وہ تہذیب و ثقافت کے سارے امتیازات نظر انداز کر کے اور تمام سیاسی مفادات پسِ پشت ڈال کر ایک قومیت بن جائیں اور ان میں ہر قسم کی جارحیت کے خلاف صف آرا ہونے کا عزم اور حوصلہ بھی پیدا ہو جائے۔ اِس مصنوعی اتحاد کے لیے گذشتہ سالوں میں نیروبی، فرانس، منیلا میں منعقدہ کانفرنسیں ناکام ہوئیں اور میکسیکو کانفرنس میں جس طرح یہ بات کھُل کر سامنے آئی کہ آج کے دَور میں معاشی مفادات گو بڑے اہم خیال کیے جاتے ہیں مگر وہ سیاسی مفادات کے تابع ہی ہوتے ہیں، اس نے تیسری دنیا کے تصوّر کو خاصا دُھندلا کر دیا ہے۔

خواب و خیال کی دُنیا میں بسنے والے اِس اتحاد کے بارے میں جس خوش فہمی میں چاہیں گرفتار رہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عالمِ واقعات میں یہ اتحاد بڑا ہی ناپائدار ہے اور اِس کی بنیاد تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ سو سے زائد ممالک جن کی معاشی سطح ایک دوسرے سے مختلف ہے اور جو تین وسیع تر اعظموں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے سیاسی مفادات ایک دوسرے سے متصادم ہیں، انہیں

اقتصادی اساس پر جمع کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں، خصوصاً اُن حالات میں جب کہ ان میں سے کوئی ایک ملک بھی پوری طرح خود مختار نہیں اور ان میں سے ہر ایک کسی بڑی طاقت کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ کیا دُنیا کے اِس نقشے میں اس بات کی کوئی توقع کی جاسکتی ہے کہ بڑی طاقتیں غیر معمولی فیاضی سے کام لیتے ہوئے اپنے زیر اثر ممالک کو اِس بات کی اجازت دے دیں گی کہ وہ اپنے معاشی مفادات کی خاطر جس دھڑے کے ساتھ چاہیں اپنے آپ کو وابستہ کرلیں؟ مثال کے طور پر تیسری دنیا میں لاطینی امریکہ کی کئی ایک ریاستیں شامل ہیں۔ کیا عقل یہ باور کرسکتی ہے کہ امریکہ اُن کے طرزِ عمل کے بارے میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرے گا اور اگر چین اور روس سے وابستگی اُن کے لیے معاشی اعتبار سے خیر و برکت کا باعث ہو تو امریکہ بہادر اُنہیں اس امر کی اجازت دے دے گا کہ وہ اُن سے وابستہ ہوجائیں؟ کیا افریقہ کی متعدد ریاستیں جنہیں مغربی قوموں نے حال ہی میں آزادی کا پروانہ دیا ہے اور جو اکثر و بیشتر معاملات میں اپنے پرانے آقاؤں کی دست نگر ہیں اُن کے مفادات کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کی جرأت کرسکیں گی؟

پھر جو لوگ فلسفۂ اجتماع سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اِس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جذبہ جو مختلف افراد، گروہوں اور قوموں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے اُس میں روحانیت کا عنصر غالب قوت کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ روحانیت مذہبی ہو، لیکن مادہ سے ماوراء ایک لطیف احساس جب تک کسی جذبہ کا جزو نہیں بنتا وہ جذبہ کسی لحاظ سے بھی مؤثر ثابت نہیں ہوسکتا۔ مشہور مصنف DENISON نے اپنی معروف کتاب EMOTION AS THE BASIS OF CIVILIZATION (جذبہ بحیثیت اساس تہذیب) میں اس موضوع پر تفصیل سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ رُوحانی عناصر ہی جذبات کی عنان تعمیر و ترقی کی طرف موڑتے ہیں اور اُن کے اندر اعتدال، توازن اور ثبات پیدا کرکے اُنہیں نوعِ انسانی کے لیے مفید اور کارآمد بناتے ہیں، اور اگر یہ جذبات روحانی عناصر سے محروم رہیں تو پھر وہ منفی داعیات بن کر تخریب کی راہ پر بہہ نکلتے ہیں۔ آپ مثال کے طور پر وطن پرستی کے جذبہ کو ہی لیں۔ یہ جذبہ اپنی جگہ کتنا ہی قابلِ قدر سہی، لیکن محض اِس جذبہ کے تحت کسی ملک کے باشندے اپنا مال اور اپنی متاعِ حیات قربان کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتے جب تک وطن میں الوہیت کا وصف پیدا کرکے اُسے اِلٰہ نہ بنالیا جائے۔ دَورِ جدید میں چین نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ محض وطن سے محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ چین پرستی اور ماؤ پرستی (باقی بر صفحہ ۴۸)

باب (۱۱)

اِسراء و معراج

(۴)

حضورؐ کو پنج وقتہ نماز کی تعلیم جس رات معراج ہوئی اُس کے بعد دو دن تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل علیہ السلام ہر نماز کے وقت حضورؐ کے پاس یہ بتانے کے لیے آتے رہے کہ جو پانچ نمازیں فرض کی گئی ہیں، ان کو ادا کرنے کے اوقات کیا ہیں۔ انہوں نے ہر نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امامت میں پہلے دن اوّل وقت پڑھائی اور دوسرے دن آخر وقت، پھر کہا کہ ہر نماز کا وقت ان دونوں اوقات کے درمیان ہے۔ یہ روایت امام احمدؒ، نسائی، ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے نقل کی ہے اور امام بخاری نے اسے اوقاتِ نماز کے معاملہ میں صحیح ترین چیز قرار دیا ہے۔ اِسی مضمون کی روایت تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ امام احمدؒ، ترمذی، ابوداؤد، ابن خزیمہ، دار قطنی، حاکم اور عبدالرزاق نے حضرت عبداللہؓ بن عباس سے نقل کی ہے اور اس کو ابن عبدالبرؒ اور قاضی ابوبکر بن العربی نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام زُہری کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے جب عُروہ بن زُبیر نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریلؑ نے اپنی امامت میں نماز پڑھائی، تو انہوں نے متعجب ہو کر کہا، عروہ، سوچو تم کیا کہہ رہے ہو۔ یعنی حضورؐ کی امامت جبریلؑ نے کی؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے بشیر بن ابی مسعود سے سنا، اور انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابومسعود انصاری سے سُنا، اور انہوں نے کہا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ جبریلؑ نازل ہوئے اور انہوں نے میری امامت کی، اور میں نے ان کے ساتھ پانچوں وقتوں کی نماز پڑھی (مؤطا، بخاری، مسلم، عبدالرزاق، طبرانی)۔

معراج کا پیغام معراج کے اِس سفر سے واپس آکر جو پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دیا وہ قرآن مجید کی سترھویں سورۃ ـــــ سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۲ تا ۳۹) میں لفظ بلفظ محفوظ ہے۔ اس کو دیکھیے اور اُس کے اِس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ یہ ہدایات ہجرت سے

ایک سال پہلے دی گئی تھیں۔ آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کے اصولوں پر ایک نئی ریاست کا سنگِ بنیاد رکھنے سے پہلے وہ ہدایات دی جا رہی ہیں جن پر نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ کو آگے کام کرنا تھا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ سے عبرت اس پیغام میں معراج کا ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے بنی اسرائیل کی تاریخ سے عبرت دلائی گئی ہے۔ مصریوں کی غلامی سے نکل کر بنی اسرائیل نے جب آزادانہ زندگی شروع کی تھی تو خداوند عالم نے اُن کی رہنمائی کے لیے کتاب عطا فرمائی تھی اور تاکید کر دی تھی کہ میرے سوا اب اپنے معاملات میں کسی اور کی ہدایت پر اعتماد نہ کرنا۔ مگر بنی اسرائیل نے خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے کفرانِ نعمت کیا اور وہ زمین میں مصلح بننے کے بجائے مفسد و سرکش بن کر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ایک مرتبہ ان کو بابل والوں سے پامال کرایا، اور دوسری مرتبہ رومیوں کو ان پر مسلط کر دیا۔ اس سبق آموز تاریخ کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خبردار کر دیا کہ صرف قرآن ہی وہ چیز ہے جو تمھیں ٹھیک ٹھیک راستہ بتائے گی، اس کی پیروی میں کام کرو گے تو تمھارے لیے بڑے انعام کی بشارت ہے۔

ہر شخص ذمہ دار ہے دوسری اہم حقیقت جس کی طرف توجہ دلائی گئی وہ یہ ہے کہ ہر انسان خود اپنی ایک مستقل اخلاقی ذمہ داری رکھتا ہے۔ اُس کا اپنا عمل اُس کے حق میں فیصلہ کن ہے۔ سیدھا چلے گا تو آپ اپنا بھلا کرے گا۔ غلط راہ پر چلے گا تو خود ہی نقصان اٹھائے گا۔ اس شخصی ذمہ داری میں کوئی کسی کا شریک نہیں ہے اور نہ کسی کا بار کسی دوسرے پر پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا ایک صالح معاشرے کے ہر ہر فرد کو اپنی ذاتی ذمہ داری پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہوں، اُسے پہلی فکر یہ ہونی چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔

بڑے لوگوں کا بگاڑ تیسری بات جس پر متنبہ کیا گیا وہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اُس کے بڑے لوگوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اُس کے خوش حال اور صاحبِ اقتدار لوگ فسق و فجور پر اُتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہو اُسے فکر رکھنی چاہیے کہ اس کے ہاں سیاسی اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔

دنیا کے سامنے آخرت کی اہمیت پھر مسلمانوں کو وہ بات یاد دلائی گئی جو قرآن میں بار بار دہرائی جاتی رہی

ہے کہ اگر تمہارے پیشِ نظر صرف یہی دُنیا اور اس کی کامیابیاں اور خوشحالیاں ہوں تو یہ سب کچھ تمہیں مل سکتا ہے، مگر اس کا آخری انجام بہت بُرا ہے۔ مستقل اور پائدار کامیابی، جو اِس زندگی سے لے کر دوسری زندگی تک کہیں نامُرادی سے داغدار نہیں ہونے پاتی، تمہیں صرف اُسی صورت میں مل سکتی ہے جبکہ تم اپنی کوششوں میں آخرت اور اُس کی بازپرس کو پیشِ نظر رکھو۔ دنیا پرست کی خوشحالی بظاہر تعمیر کی شان رکھتی ہے، لیکن اِس تعمیر میں ایک بہت بڑی خرابی کی صورت بھی مُضمر ہے۔ وہ اخلاق کی اُس فضیلت سے محروم رہتا ہے جو صرف آخرت کی جوابدہی کا احساس رکھنے ہی سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ یہ فرق تم دنیا ہی میں دونوں طرح کے آدمیوں کے درمیان دیکھ سکتے ہو۔ یہی فرق بعد کی منازلِ حیات میں اور زیادہ نمایاں ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک کی زندگی سراسر ناکامی اور دوسرے کی زندگی سراسر کامیابی بن کر رہے گی۔

اسلامی تمدن کے اساسی اصول | ان تمہیدی نصیحتوں کے بعد وہ بڑے بڑے اصول بیان کیے گئے ہیں جن پر آئندہ اسلامی ریاست اور معاشرے کی تعمیر ہونی تھی۔ یہ چودہ[14] اُصول ہیں، اور ہم انہیں اُسی ترتیب سے پیش کرتے ہیں جس طرح وہ معراج کے اِس پیغام میں بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ خدائے واحد کے سوا کسی کی خداوندی نہ مانی جائے۔ صرف وہی تمہارا معبود ہو، اُسی کی تم بندگی و اطاعت کرو، اور اسی کے حکم کی پیروی تمہارا شعار رہے۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور کا اقتدارِ اعلیٰ تم نے تسلیم کیا، خواہ وہ کوئی غیر ہو یا تمہارا اپنا نفس، تو آخرکار تم قابلِ مذمّت بن کر رہو گے اور اُن برکتوں سے محروم ہو جاؤ گے جو صرف خدا کی تائید سے ہی حاصل ہوا کرتی ہیں[1]۔

۲۔ انسانی حقوق میں سب سے اہم اور مُقدّم حق والدین کا ہے۔ اولاد کو والدین کا مطیع، خدمت گذار اور ادب شناس ہونا چاہیے۔ معاشرے کا اجتماعی اخلاق ایسا ہونا چاہیے جس میں اولاد والدین سے بے نیاز اور سرکش نہ ہو بلکہ اُن سے نیک سلوک کرے، ان کا احترام ملحوظ رکھے اور بڑھاپے میں اُن کی

---

[1] یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ ہی نہ تھا بلکہ اُس سیاسی نظام کا، جسے بعد میں مدینے پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا، اوّلین بنیادی اصول بھی تھا۔ اُس کی پوری عمارت اِس نظریے پر اُٹھائی گئی تھی کہ خداوندِ عالم ہی ملک کا مالک اور بادشاہ ہے اور خدا کی شریعت ہی ملک کا قانون ہے۔ اس قانونِ برتر کی ماتحتی سے کوئی شخص، کوئی ادارہ، کوئی پارلیمنٹ، کوئی عدلیہ اور کوئی انتظامیہ مستثنیٰ نہیں ہے۔

وہی ناز برداری کرے جو کبھی بچپن میں وہ اُس کی کر چکے ہیں۔[1]

۳ - اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی اور حق شناسی و حق رسانی کی روح جاری و ساری ہے۔ ہر رشتہ دار اپنے دوسرے رشتہ دار کا مددگار ہو۔ ہر محتاج انسان دوسرے انسانوں سے مدد پانے کا حق دار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرے میں حق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص اُن سب انسانوں کے حقوق اپنے اُوپر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہے۔ ان کی کوئی خدمت کرے تو یہ سمجھے کہ وہ اُن کا حق ادا کر رہا ہے نہ کہ احسان کا بوجھ ان پر لاد رہا ہے۔ اور اگر کسی خدمت کے قابل نہ ہو تو معذرت کرے اور خدا سے فضل مانگے تا کہ وہ دوسروں کے کام آسکے۔[2]

۴ - لوگ اپنی دولت کو غلط طریقوں سے ضائع نہ کریں۔ فخر اور ریا اور نمائش کے خرچ، عیّاشی اور فسق و فجور کے خرچ، جو انسان کی حقیقی ضروریات اور مفید کاموں میں صرف ہونے کے بجائے دولت کو

[1] اس دفعہ کی رُو سے یہ طے کر دیا گیا کہ اسلامی نظامِ معاشرت کی بنا خاندان پر رکھی جائے گی اور خاندانی نظام کا محور والدین کا ادب و احترام ہوگا۔ بعد میں اسی دفعہ کے منشا کے مطابق والدین کے وہ شرعی حقوق متعین کیے گئے جن کی تفصیلات ہم کو حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آدابِ تہذیب میں وہ خیالات و اطوار پیوست کر دیے گئے جو خدا اور رسول کے بعد والدین کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان چیزوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا کہ اسلامی ریاست اپنے قوانین اور انتظامی احکام کے ذریعے سے خاندان کو کمزور کرنے کے بجائے مضبوط اور محفوظ کرنے کی کوشش کرے گی۔

[2] اس دفعہ کی بنیاد پر مدینۂ طیبہ کے معاشرے میں صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ کے احکام دیے گئے۔ وصیت، وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کیے گئے۔ یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا گیا۔ ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ کم از کم تین دن تک اس کی ضیافت کی جائے۔ اور پھر اخلاقی تعلیمات کے ذریعے سے پوری معاشرے میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی ایسی روح پھونک دی گئی کہ لوگوں کے اندر قانونی حقوق کے ماسوا اخلاقی حقوق کا ایک وسیع ترین تصور پیدا ہو گیا، اور اُس کی بنا پر لوگ خود بخود ایک دوسرے کے ایسے حق بھی پہچاننے اور ادا کرنے لگے جو کسی قانون کے زور سے نہ مانگے جا سکتے ہیں اور نہ دلوائے جا سکتے ہیں۔

غلط راستوں میں بہا دیں، دراصل خدا کی نعمت کا کفران ہیں۔ جو لوگ اس طرح اپنی دولت کو خرچ کرتے ہیں وہ حقیقت میں شیطان کے بھائی ہیں اور ایک صالح معاشرے کا فرض ہے کہ ایسے بے جا صَرفِ مال کو اخلاقی تربیت اور قانونی پابندیوں کے ذریعہ سے روک دے۔

۵۔ لوگوں میں اتنا اعتدال ہونا چاہیے کہ وہ نہ تو بخیل بن کر دولت کی گردش کو روکیں اور نہ فضول خرچ بن کر اپنی معاشی طاقت کو ضائع کریں۔ معاشرے کے افراد میں توازن کی ایک ایسی صحیح حس پائی جانی چاہیے کہ وہ بجا خرچ سے باز بھی نہ رہیں اور بے جا خرچ کی خرابیوں میں مبتلا بھی نہ ہوں[1]۔

۶۔ خدا نے اپنے رزق کی تقسیم کا جو نظام قائم کیا ہے انسان اپنی مصنوعی تدبیروں سے اُس میں خلل انداز نہ ہو۔ اُس نے اپنے سب بندوں کو رزق میں مساوی نہیں رکھا ہے بلکہ اُن کے درمیان کم و بیش کا فرق رکھا ہے۔ اِس کے اندر بہت سی مصلحتیں ہیں جن کو وہ خود ہی بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا ایک صحیح معاشی نظام وہی ہے جو خدا کے مقرر کیے ہوئے اِس طریقہ سے قریب تر ہو۔ فطری نامساوات کو ایک مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا یا نامساوات کو فطرت کی حدود سے بڑھا کر بے انصافی کی حد تک پہنچا دینا، دونوں یکساں

[1] مدینے کی سوسائٹی میں اِن دونوں دفعات کے منشاء کی ترجمانی مختلف طریقوں سے کی گئی۔ ایک طرف فضول خرچی اور عیاشی کی بہت سی صورتوں کو ازروئے قانون حرام کر دیا گیا۔ دوسری طرف بالواسطہ قانونی تدابیر سے بھی بے جا صَرفِ مال کی روک تھام کی گئی۔ تیسری طرف حکومت کو یہ اختیارات دیے گئے کہ اِسراف کی نمایاں صورتوں کو وہ اپنے انتظامی احکام کے ذریعہ سے روک دے، اور جو لوگ اپنے مال میں بہت زیادہ ناروا طریقوں سے تصرف کرنے لگیں ان کی جائداد کو عارضی طور پر خود اپنے انتظام میں لے لے۔ ان تدابیر کے علاوہ معاشرے میں ایک ایسی رائے عام بھی پیدا کی گئی جو فضول خرچیوں پر واہ واہ کرنے کے بجائے ملامت کرے، اور اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے افراد کے نفس کی اصلاح بھی کی گئی تاکہ وہ بجا اور بے جا خرچ کے فرق کو خود سمجھیں اور بے جا خرچیوں سے آپ ہی باز رہیں۔ اِسی طرح بخل کو بھی جس حد تک قانون کے ذریعے سے توڑا جا سکتا تھا اس کے لیے قانون سے کام لیا گیا، اور باقی اصلاح کا کام رائے عام کے زور اور اخلاقی تعلیم کی طاقت سے لیا گیا۔ آج یہ اُسی کا اثر ہے کہ مسلمان سوسائٹی میں کنجوسوں اور زر اندوزوں کو جس بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کی مثال کسی دوسری سوسائٹی میں نہ ملے گی۔

غلط ہیں۔

۷۔ نسلوں کی افزائش کو اس ڈر سے روک دینا کہ کھانے والے بڑھ جائیں گے تو معاشی ذرائع تنگ ہو جائیں گے، ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ جو لوگ اس اندیشے سے آنے والی نسل کو ہلاک کرتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ رزق کا انتظام اُن کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ رازق وہ خدا ہے جس نے انسانوں کو زمین میں بسایا ہے۔ پہلے آنے والوں کے لیے بھی رزق کا سامان اُسی نے کیا تھا اور بعد کے آنے والوں کے لیے بھی وہی سامان کرے گا۔ جتنی آبادی بڑھتی ہے خدا اُسی نسبت سے معاشی ذرائع بھی وسیع کر دیتا ہے۔ لہٰذا لوگ خدا کے تخلیقی انتظامات میں بے جا دخل اندازی نہ کریں اور کسی قسم کے حالات میں بھی اُن کے اندر "نسل کشی" کا میلان پیدا نہ ہونے پائے۔

لہ اس دفعہ میں قانونِ فطرت کے جس اصول کی طرف رہنمائی کی گئی تھی اس کی وجہ سے مدینے کے اصلاحی پروگرام میں یہ تخیّل سرے سے کوئی راہ ہی نہ پاسکا کہ رزق اور وسائلِ رزق میں تفاوت اور تفاضل بجائے خود کوئی بے انصافی ہے، اور انصاف قائم کرنے کے لیے امیری اور غریبی کا فرق مٹانا اور ایک "بے طبقات معاشرہ" پیدا کرنے کی کوشش کرنا کسی درجہ میں بھی مطلوب ہے۔ اِس کے برعکس مدینۂ طیبہ میں انسانی تمدن کو صالح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جو راہِ عمل اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ فطرتُ اللہ نے انسانوں کے درمیان جو فرق رکھے ہیں ان کو اصل فطری حالت پر جُوں کا تُوں برقرار رکھا جائے اور دفعات ۳، ۴، ۵ کے مطابق سوسائٹی کے اخلاق و اطوار اور قوانین کی اِس طرح اصلاح کر دی جائے کہ معاش کا فرق و تفاوت کسی ظلم و بے انصافی کا موجب بننے کے بجائے اُن بے شمار اخلاقی و روحانی اور تمدنی فوائد کا ذریعہ بن جائے جن کی خاطر ہی دراصل خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کے درمیان یہ فرق و تفاوت رکھا ہے۔

سلہ یہ دفعہ اُن معاشی بنیادوں کو قطعی طور پر منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے لے کر آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت کی تحریک اُٹھتی رہی ہے۔ قدیم زمانے میں افلاس کا خوف قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا۔ اور آج وہ ایک تیسری تدبیر یعنی منعِ حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن معراج کے پیغام کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر کھانے کے ذرائع بڑھانے کی تعمیری سعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے۔

۸ ۔ زنا عورت اور مرد کے تعلق کی بالکل ایک غلط صورت ہے ۔ اس کو نہ صرف بند ہونا چاہیے بلکہ معاشرے کے اندر اُن اسباب کا بھی سدِّباب کیا جانا چاہیے جو انسان کو اس کے قریب لے جاتے ہیں۔[1]

۹ ۔ انسانی جان کو اللہ تعالیٰ نے قابلِ احترام ٹھیرایا ہے ۔ کوئی شخص نہ اپنی جان لینے کا حق رکھتا ہے نہ کسی دوسرے کی جان ۔ خدا کی مقرر کی ہوئی یہ حرمت صرف اُسی صورت میں ٹوٹ سکتی ہے جب کہ خدا ہی کا مقرر کیا ہوا کوئی حق اس کے خلاف قائم ہو جائے ۔ پھر حق قائم ہو جانے کے بعد بھی خونریزی صرف اُس حد تک ہونی چاہیے جہاں تک حق کا تقاضا ہو ۔ قتل میں اسراف کی تمام صورتیں بند ہو جانی چاہئیں ۔ مثلاً جوشِ انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنا جن کے خلاف حق قائم نہیں ہوا ہے ، یا مجرم کو عذاب دے دے کر مارنا ، یا مار دینے کے بعد اُس کی لاش کی بے حُرمتی کرنا ، یا ایسی ہی دوسری انتقامی زیادتیاں جو دُنیا میں رائج رہی ہیں۔[2]

۱۰ ۔ یتیموں کے مفاد کی اُس وقت تک حفاظت ہونی چاہیے جب تک وہ خود اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو جائیں ۔ ان کے مال میں کوئی ایسا تصرف نہ ہونا چاہیے جو خود ان کے مفاد کے لیے

---

[1] یہ دفعہ آخر کار اسلامی نظامِ زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد بنی ۔ اس کے منشا کے مطابق زنا اور تہمتِ زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا ، پردے کے احکام جاری کیے گئے ۔ فواحش کی اشاعت پر پابندیاں عائد کی گئیں ۔ شراب اور موسیقی اور رقص اور تصاویر پر بندشیں لگائی گئیں اور ایک ایسا ازدواجی قانون بنا دیا گیا جس سے نکاح نہایت آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کا خاتمہ کر دیا گیا۔

[2] اس دفعہ کی بنا پر اسلامی قانون میں خودکشی کو حرام کیا گیا ۔ قتلِ عمد کو جرم ٹھیرایا گیا ۔ قتلِ خطا کی مختلف صورتوں کے لیے خوں بہا اور کفارے تجویز کیے گئے ۔ اور قتل بالحق کو صرف پانچ صورتوں میں مقید کر دیا گیا ۔ ایک یہ کہ کوئی شخص قتلِ عمد کا مرتکب ہوا ہو ۔ دوسرے یہ کہ کوئی گروہ دینِ حق کے راستے میں ایسی مزاحمت کرے جس پر اُس کے خلاف جنگ ناگزیر ہو جائے ۔ تیسرے یہ کہ کسی شادی شدہ مرد یا عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہو ۔ چوتھے یہ کہ کسی گروہ نے اسلامی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کی ہو یا اسلامی نظامِ جماعت کے خلاف خروج کیا ہو ۔ پانچویں یہ کہ کسی نے مسلمان ہونے کے بعد کفر اختیار کیا ہو ۔ پھر قتل بالحق کا فیصلہ کرنے کے اختیارات بھی صرف قاضیِ شرع کو دیے گئے ، اور اس کا ایک مہذب ضابطہ بنا دیا گیا۔

بہتر نہ ہو۔[1]

۱۱۔ عہد و پیمان، خواہ افراد ایک دوسرے سے کریں یا ایک قوم دوسری قوم سے کرے، بہرحال ایمانداری سے پورے کیے جائیں۔ معاہدوں کی خلاف ورزی پر خدا کے ہاں بازپرس ہوگی۔[2]

۱۲۔ ناپ اور پیمانے اور اوزان ٹھیک رکھے جائیں اور لین دین میں صحیح تول تولی جائے۔[3]

۱۳۔ تم کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کے صحیح ہونے کا تمہیں علم نہ ہو۔ اپنی سماعت اور بینائی کا اور اپنے دلوں کی نیتوں اور خیالات اور ارادوں کا تمہیں حساب دینا ہے۔[4]

[1] یہ بھی محض ایک اخلاقی ہدایت نہ تھی، بلکہ یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لیے اسلامی نظامِ حکومت میں قانونی اور انتظامی دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں جن کی تفصیلات ہم کو حدیث و فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ پھر اسی دفعہ سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ ریاست اپنے اُن تمام شہریوں کے مفاد کی محافظ ہے جو خود اپنے مفاد کی حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اَنَا وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَہٗ (جس کا ولی کوئی نہیں اس کا ولی میں ہوں) اسی طرف اشارہ ہے اور یہ اسلامی قانون کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہے۔

[2] یہ بھی صرف اسلامی اخلاقیات ہی کی ایک اہم دفعہ نہ تھی بلکہ آگے چل کر اسلامی حکومت نے اسی کو اپنی داخلی اور خارجی سیاست کا سنگِ بنیاد قرار دیا۔

[3] اس دفعہ کے مطابق اسلامی حکومت کے محکمۂ احتساب پر منجملہ دوسرے فرائض کے یہ فرض بھی عائد ہوا کہ وہ منڈیوں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کرے اور تطفیف کو بزور بند کر دے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ تجارت اور لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانیوں اور حق تلفیوں کا سدباب کرنا حکومت کا فرض ہے۔

[4] اس دفعہ کا منشا یہ تھا کہ مسلمان اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان اور قیاس کے بجائے "علم" کی پیروی کریں۔ اس منشا کی ترجمانی اخلاق میں، قانون میں، ملکی نظم و نسق اور سیاست میں، اور نظامِ تعلیم میں مختلف طریقوں سے بہت وسیع پیمانے پر کی گئی۔ اور اُن بے شمار خرابیوں سے اسلامی معاشرے کو بچا لیا گیا جو علم کے بجائے گمان کی پیروی کرنے سے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلاتحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اصول مقرر کیا گیا کہ محض شبہ پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیشِ جرائم میں یہ قاعدہ طے کر دیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا اور مار پیٹ کرنا (باقی بر صفحہ ۱۷)

۱۴۔ زمین میں جباروں اور متکبروں کی چال نہ چلو۔ تم نہ اپنی اکڑ سے زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ اپنے غرور میں پہاڑوں سے سربلند ہو سکتے ہو[1]۔

یہی وہ اصول تھے جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے پہنچ کر اسلامی سوسائٹی اور اسلامی ریاست کی تعمیر فرمائی۔

حضورؐ کو دعائے ہجرت کی تلقین اسی سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے وہ دعا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی جسے حقیقت میں دعائے ہجرت کہا جا سکتا ہے۔ ترمذی اور حاکم نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا اذن دیا گیا تھا:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ	اور اے نبیؐ، دعا کرو کہ پروردگار مجھ کو جہاں
وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ	بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں
اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا	سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے
نَّصِیْرًا (بنی اسرائیل آیت ۸۰)	ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) یا حوالات میں ٹھونس دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ میں بھی یہ پالیسی معین کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے اور نہ شبہات پر افواہیں پھیلائی جائیں۔ نظامِ تعلیم میں بھی اُن تمام نام نہاد "علوم" کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن و تخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں اور مسلمانوں کے اندر ایک حقیقت پسندانہ ذہنیت پیدا کی گئی۔

[1] (حاشیہ صفحہ ہٰذا) یہ بھی محض ایک واعظانہ بات نہ تھی بلکہ درحقیقت اس میں مسلمانوں کو پیشگی تنبیہ کی گئی تھی کہ ایک حکمران گروہ بننے کے بعد وہ غرور و تکبر میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ جو حکومت اس منشور کے مطابق مدینۂ طیبہ میں قائم کی گئی اس کے فرمانرواؤں، گورنروں اور سپہ سالاروں کی زبان یا قلم سے نکلا ہوا ایک جملہ بھی آج ہمیں ایسا نہیں ملتا جس میں ادائے تکبر کا ادنیٰ شائبہ تک پایا جاتا ہو۔ حتیٰ کہ جنگ میں بھی انہوں نے کبھی فخر و غرور کی کوئی بات زبان سے نہ نکالی۔ ان کی نشست و برخاست، چال ڈھال اور عام برتاؤ ہر چیز میں انکسار و تواضع کی شان پائی جاتی تھی اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتے تھے اُس وقت بھی اکڑ اور تبختر سے کبھی اپنا رعب جمانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

اس دُعا کی تلقین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا وقت اب بالکل قریب آ گیا تھا - اس لیے فرمایا کہ تمہاری دعا یہ ہونی چاہیے کہ صداقت کا دامن کسی حال میں تم سے نہ چھوٹے - جہاں سے بھی نکلو صداقت کی خاطر نکلو اور جہاں بھی جاؤ صداقت کے ساتھ جاؤ -

" اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے "- یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اُس کی طاقت سے مَیں دُنیا کے اِس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش اور مَعاصی کے اِس سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں - اِس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے - پھر جبکہ یہ دُعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو خود سکھائی ہے اور حدیث میں بھی یہ الفاظ ملتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ ، یعنی " اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے اُن چیزوں کا سدِّباب کر دیتا ہے جن کا سدِّباب قرآن سے نہیں کرتا " تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ اقامتِ دین اور نفاذِ شریعت اور اِجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مطلوب و مَندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اِسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں - دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو - رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے -

مظلوم مسلمانوں کو دعائے نصرت کی تلقین معراج ہی کے موقع پر سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئیں، جیسا کہ ہم اِس سے پہلے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت سے نقل کر چکے ہیں - اِن آیات کا اختتام اِس دُعا پر ہوتا ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا .... فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ

" اے ہمارے رب، ہم سے اگر بھول چوک میں کچھ قصور ہو گئے ہوں تو ان پر گرفت نہ کر - مالک، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے - پروردگار، جس بار کو اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ - ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگذر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر "-

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ یہ دُعا اُن حالات میں سکھائی گئی تھی جب مکے میں کفر و اسلام کی کشمکش انتہا کو پہنچ چکی تھی،

مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اور صرف مکے ہی میں نہیں، پوری سرزمینِ عرب میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندۂ خدا نے دینِ حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے خدا کی زمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دُعا مانگا کرو۔ ظاہر ہے کہ دینے والا خود ہی جب مانگنے کا ڈھنگ بتائے، تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ دُعا اس وقت مسلمانوں کے لیے غیر معمولی تسکینِ قلب کی موجب ہوئی۔ علاوہ بریں اس دُعا میں ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کر دی گئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی نامناسب رُخ پر نہ بہنے دیں بلکہ انہیں اس دُعا کے سانچے میں ڈھال لیں۔ ایک طرف اُن روح فرسا مظالم کو دیکھیے جو محض حق پرستی کے جرم میں ان لوگوں پر توڑے جا رہے تھے، اور دوسری طرف اس دُعا کو دیکھیے جس میں دشمنوں کے خلاف کسی تلخی کا شائبہ تک نہیں۔ ایک طرف اُن جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانات کو دیکھیے جن میں یہ لوگ مبتلا تھے، اور دوسری طرف اس دُعا کو دیکھیے جس میں کسی دنیوی مفاد کی طلب کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں ہے۔ ایک طرف اُن حق پرستوں کی انتہائی خستہ حالی کو دیکھیے، اور دوسری طرف اِن بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھیے جن سے یہ دُعا لبریز ہے۔ اس تقابل ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اہلِ ایمان کو کس طرز کی اخلاقی و روحانی تربیت دی جا رہی تھی۔

(باقی)

ضروری تصحیح

—— تفہیم القرآن جلد ششم حاشیہ ایک سطر ۹ کی موجودہ عبارت بدل کر اس طرح لکھی جائے:

"حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کے باپ قیس بن زائدہ اور حضرت خدیجہؓ کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ آپس میں بہن بھائی تھے۔"

—— تفہیم القرآن جلد اوّل، صفحہ ۹۰، سطر ۱۵ میں ساگ، ترکاری کے بعد کھیرا، ککڑی کا اضافہ کر لیا جائے

—— ترجمۂ قرآن مع مختصر حواشی، صفحہ ۳۹، سطر ۱۲ میں بھی ساگ، ترکاری کے بعد کھیرا ککڑی کا اضافہ کر لیا جائے۔

مصر میں تحریکِ احیائے اسلام کا از سرِ نو آغاز

از جناب خلیل حامدی صاحب

مصر نے اشتراکیت اور آمریت کا بیس سالہ دَور گزارنے کے بعد اب جو نیا رُخ اختیار کیا ہے اُس پر ہر مصری کسی حد تک مطمئن نظر آتا ہے۔ سابقہ دَور میں بھائی، بھائی سے اور دوست، دوست سے خائف رہتا تھا۔ جاسوسی کے وسیع نظام نے کسی ادارے میں بھی اعتماد اور سکون کی فضا نہ رہنے دی تھی۔ مصر کے سابق اٹارنی جنرل عبدالسلام کے بیان کے بموجب مصر کے ججوں کے اندر بھی خفیہ سروس کے لوگ موجود تھے۔ بہرحال اب یہ باتیں ماضی کی دلخراش کہانیوں کے طور پر تو دُہرائی جاتی ہیں، مگر خوف و دہشت کا ماحول ختم ہو گیا ہے اور لوگ گھروں میں ہوں یا قہوہ خانوں میں، دفتروں میں ہوں یا تعلیم گاہوں میں، اپنے آپ کو محفوظ و مامون محسوس کرتے ہیں۔ عام اجتماعی زندگی میں بھی بڑی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب عریانی اور فحاشی کو اس قدر چھوٹ مل چکی تھی کہ قاہرہ اور اسکندریہ جیسے بڑے بڑے شہر یورپ کے فاسد ترین شہروں کا عکس پیش کر رہے تھے۔ شراب کی دکانیں اور باریں عام تھیں، سنیما اور تھیٹر بے حیائی میں مسابقت کر رہے تھے، کوافیر (عورتوں کے بال بنانے کے مراکز) میں نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کے جھمگٹے رہتے تھے، اُزبکیہ گارڈن، شارع فؤاد الاوّل، اور میدان التحریر راجہ اندر کا اکھاڑا معلوم ہوتے تھے۔ ادب و ثقافت کے پردے میں کم سن لڑکوں اور لڑکیوں کو آوارگی اور لذت پرستی کا رسیا بنانے کے لیے اتحادِ اشتراکی نے اسکولوں اور کالجوں کی فضا کو بے حد مکدّر کر دیا تھا۔ ایک طرف یہ صورتِ حال تھی اور دوسری طرف جو لوگ دینداری کا اظہار کرتے، مسجدوں میں جا کر نمازیں پڑھتے یا ڈاڑھی رکھ لیتے اُن کا تعاقب کیا جاتا، اور انہیں خطرناک سمجھ کر خفیہ پولیس کے ذریعے انہیں نہ صرف زِچ کیا جاتا بلکہ بسا اوقات جیلوں میں ڈال دیا جاتا۔ ہر متدیّن آدمی "دہشت پسند" قرار دیا گیا، اور اسے "الاخوان المسلمون" کا آدمی سمجھ کر ہر طرح کا ظلم اُس کے ساتھ روا

رکھا گیا - اب یہ یک طرفہ کھیل ختم ہو چکا ہے - الاخوان المسلمون کے لوگوں کی رہائی کے بعد مصر کے اسلامی ذہن میں یکایک زندگی اور جرأت پیدا ہو گئی ہے اور نوجوان نسل کے اندر خاص طور پر حیرت انگیز تبدیلی رُونما ہو رہی ہے -

"الاخوان المسلمون" پر مظالم کی کہانی بہت طویل ہے - اخوان کے مجلّہ ماہنامہ الدّعوۃ نے اکتوبر ۱۹۷۶ء کے شمارے میں مصری عوام کے سامنے اعداد و شمار کی زبان میں اخوان پر مظالم کی جو داستان بیان کی ہے اُس نے ہر شخص کو وَرطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے - یہ داستان مصر کے نامور ایڈووکیٹ محمد شمس الدین الشناوی نے بیان کی ہے - موصوف اخوان کے تمام مقدمات لڑتے رہے ہیں اور اسی پاداش میں خود بھی نشانۂ ابتلاء بنے رہے ہیں - وہ بیان کرتے ہیں کہ فلسطین اور سویز کی جنگ کے علاوہ جمال عبدالناصر کے ہاتھوں سزائے موت پانے والوں یا لیمان طرہ کی جیل میں بذریعہ تعذیب جامِ شہادت نوش کرنے والوں کی مجموعی تعداد ۲۶۳ ہے - ۱۹۴۶ء (شاہ فاروق کے دَور میں) اور ۱۹۵۴ء تا ۱۹۶۵ء (ناصر کے عہد میں) گرفتار کیے جانے والوں کی تعداد ۶۱ ہزار ہے - ان میں بچے، عورتیں، بوڑھے اور نابینا افراد بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں - اخوان کے لوگوں کو جو سزائیں دی گئیں ان کی مجموعی مدت ۶ لاکھ ۵۰ ہزار اور ۵۰۷ سال بنتی ہے - ان گرفتار شدگان میں سے صرف ایک ہزار ۵ سو ۴۰ افراد پر مقدمات قائم کیے گئے اور باقی تمام افراد بلا مقدمہ جیلوں میں بند رہے - اخوان کے لوگوں کی منقولہ اور غیر منقولہ ذاتی جائیدادیں، ان کی کمپنیاں اور دکانیں، ان کے مدرسے اور کلینک، ان کی فیکٹریاں اور ورکشاپیں اور ان کے مکان اور زمینیں جو ضبط کی گئیں یا برباد کی گئیں ان کی تفصیل الگ ہے -

اخوان قیدیوں اور نظربندوں کو فوجی جیلوں کے اندر جو زہرہ گداز سزائیں دی جاتی رہی ہیں ان کی تفصیلات مصر کے متعدد اخبارات و رسائل میں چھپ رہی ہیں - اور کئی افراد نے ان واقعات پر مشتمل رُودادیں قلمبند کی ہیں - کمال فرماوی کی "یومیات سجین" (قیدی کا روزنامچہ)، احمد رائف کی "البوابۃ السوداء" (سیاہ دروازہ) علی جریشہ کی "سنوات فی السجن" (جیل کے چند سال) نے لوگوں کے اندر کھلبلی مچا دی ہے - جمال فوزی جب حوالۂ زنداں کیا گیا تھا تو وہ تنومند اور بینا نوجوان تھا اور جب رہا ہوا ہے تو وہ بینائی سے محروم تھا - اُسے کس سنگدلی کے ساتھ بینائی سے محروم کیا گیا، اس کی تفصیل اُس نے الدّعوۃ کے اگست ۱۹۷۶ء کے شمارے میں بیان کی ہے - اِس ہولناک کہانی کو پڑھنے کے لیے حوصلہ درکار ہے - عہد مظلومی میں اخوان کے بارے

میں کلمۂ حق زبان سے نکالنا بلا کو دعوت دینا تھا۔ مگر اب جب شمشیر سفّاک سروں سے ہٹ چکی ہے تو ہر شخص اخوان کے مظلوم اور برحق ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے دلچسپ کتاب "الصامتون ینطقون" (خاموش رہنے والے مہر سکوت توڑتے ہیں) ہے۔ اس میں متعدد نمایاں لوگوں نے جن میں جمال عبدالناصر کے دَور کے دو وزیر کمال الدین حسین اور عبداللطیف بغدادی بھی شامل ہیں، ناصر کے مظالم کی گواہی دیتے ہیں، اور اخوان کی عظمت کا نہ صرف اعتراف کرتے ہیں بلکہ اپنے وزارتوں سے نکالے جانے کا سبب اخوان سے ہمدردی بیان کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے ناصر کی ڈکٹیٹر شپ کا ساتھ دیا اور پھر خوب مادّی فوائد لوٹے وہ غالباً یہ سمجھتے تھے کہ یہ "سنہری دَور" کبھی نہیں بدلے گا۔ مگر حالات کی اچانک تبدیلی سے ان لوگوں کے لیے سرزمینِ مصر تنگ ہو گئی ہے۔ پورے معاشرے کے اندر اُن کے لیے ذلت و رسوائی کے سوا کوئی مقام نہیں رہ گیا ہے۔ ان میں صحافی بھی ہیں اور علماء بھی۔ پولیس اور فوج کے افسر بھی ہیں اور عدالتوں کے جج بھی۔ یہ افراد خود تو تباہ ہوئے، اپنی آئندہ نسل کو بھی بے وزن کر گئے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ پھٹکار اُن ججوں پر پڑ رہی ہے جو جاہ و منصب کی خاطر آمر کا آلۂ کار بنے اور عدل و انصاف کا خون کر کے پوری مصری قوم کی گردن سفّاک اور غاصب نظام کے حوالے کر دی۔ مصر کا سابق اٹارنی جنرل عبدالسلام اپنی کتاب "سنوات عصیبہ" (مصیبت کے سال) میں لکھتا ہے کہ "ناصر کی ڈکٹیٹر شپ کو کامیاب کرنے والے مصری عدلیہ کے بیشتر ارکان تھے جنہوں نے آمریت کو قانون کے آگے سرنگوں کرنے کے بجائے قانون کو آمریت کے آگے سجدہ ریز کر دیا۔" اٹارنی جنرل نے اپنی کتاب میں ایسے ججوں کی نام بنام تفصیل بیان کر کے مصری قوم کے سامنے انہیں سامانِ عبرت بنا کر رکھ دیا ہے۔ سید قطب اور ان کے ساتھیوں کو ملٹری کورٹ کے جس جج نے سزائے موت دی تھی اُس کا نام کرنل دَجوی ہے۔ یہ شخص اب روپوش ہے۔ اسی طرح سے سول انٹیلی جنس اور ملٹری انٹیلی جنس کے افسران جن میں جلاد حمزہ بسیونی اور جلاد صلاح نصر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مصر کی تاریخ کا نہایت مکروہ کردار سمجھے جا رہے ہیں۔ مصری عوام انہیں "آلِ فرعون" کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ ناصر کے دَور میں محمد حسنین ہیکل کو راسپوٹین کا مقام حاصل تھا، مگر اب اُس کی شہرت ایک بیسوا کی شہرت سے زیادہ نہیں ہے۔ علماء کی ایک ٹولی بھی فتوٰی فروشی، جاہ طلبی اور قربِ سلطانی کا شکار ہو گئی۔ الدعوۃ نے اُس دَور کے ایک "عالمِ دین" شیخ عبدالرحیم فرغلی بلینی کا اخوان کے خلاف ایک فتوٰی نقل کیا ہے۔ یہ فتوٰی ۱۹۶۵ء میں سید قطب اور اُن کے رفقاء کی گرفتاری اور

پھر شہادت کے وقت جاری کیا گیا تھا، اور اسے مصر کی امور اسلامی کی سپریم کونسل نے پھیلایا تھا۔ اس فتوے میں مولوی صاحب نے کہا تھا کہ "صرف سید قطب اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکا دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس پورے گروہ کی بیخ کنی کی جائے۔" قربِ سلطانی کے شوق میں اُس وقت تو مولوی صاحب نے فتویٰ جاری کر دیا۔ مگر اب اُن کا مصری عوام کی نظر میں وہی مقام رہ گیا ہے جو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف فتویٰ دینے والے علماء کا تھا۔ ان کے برعکس اِس وقت سید قطب مصر کی اسلامی تاریخ کا درخشندہ ستارہ سمجھے جا رہے ہیں۔ ان کی کتابوں کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے اور مصر کی نوجوان نسل پر سید قطب کی تحریریں اور کردار خوش آیند اثرات پیدا کر رہے ہیں۔ سید کے بعض الفاظ نوجوانوں نے ازبر کر رکھے ہیں۔ قول و فعل کی ہم آہنگی کے بارے میں سید کا یہ جملہ آپ یونیورسٹی کے کسی بھی نوجوان سے زبانی سن سکتے ہیں:

"لفظ اگر ایسے دل سے نہ صادر ہو جو اُس پر ایمان رکھتا ہو تو وہ خواہ کتنا ہی پُرشکوہ، گرجدار اور شعلہ انگیز ہو بے جان اور بے اثر ہوتا ہے۔ اور کوئی شخص اسے حق نہ مانے گا جب تک اُس لفظ کو بیان کرنے والا اپنے لفظ کا زندہ پیکر اور اپنے قول کا متحرک عکس نہ بن جائے۔ ایسی صورت میں لوگ خود بخود اُس لفظ کی حقانیت کو تسلیم کریں گے اور کہنے والے پر بھرپور اعتماد کریں گے۔ اس لفظ کی طاقت اُس کی گرج نہ ہوگی بلکہ اُس کی عملی حقیقت ہوگی، اُس کی خوبصورتی کا راز اس کی رعنائی نہ ہوگی بلکہ اس کی سچائی ہوگی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۲۸ء کے بعد مصر میں پہلی مرتبہ اخوان کو جرأت کے ساتھ اصل حقائق کو بے نقاب کرنے کا موقع ملا ہے۔ اخوان کا پرانا مجلہ الدعوة جولائی ۱۹۷۶ء سے دوبارہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ پچاس ہزار چھپا تھا جو دن کے گیارہ بجے تک بک اسٹالوں سے ختم ہو گیا۔ چنانچہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک اس کی بے پناہ مانگ کی وجہ سے پہلے شمارے کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا۔ اِس وقت تک اس کے چار شمارے نکل چکے ہیں اور ہر شمارہ ۸۵ ہزار کی تعداد میں چھپ رہا ہے۔ اور ہر شمارے میں اس امر کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اخوان پر آج تک جو الزامات لگائے گئے ہیں اور ان کے رہنماؤں اور کارکنوں کو جو سزائیں دی گئی ہیں ان کی دوبارہ عدالتی تحقیقات کی جائے۔ اگست کے شمارے میں مجلہ نے عبدالقادر عودہ شہید کا مسئلہ اُٹھایا ہے اور تمام واقعات بیان کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ عودہ شہید پر مقدمہ چلانے سے پیشتر ہی ان کی موت کی سزا کا فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ ستمبر ۱۹۷۶ء کے شمارے میں شیخ فرغلی شہید اور اکتوبر کے شمارے میں سید قطب کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ اور پھر ان تمام رازوں کا انکشاف کیا گیا ہے جو اخوان کو خلافِ قانون قرار دیے جانے کے موجب

بنتے ہیں۔

" الاخوان المسلمون" کو تنظیم کی حیثیت سے بحال کرنے کی ابھی تک اجازت نہیں دی گئی ہے۔ البتہ ان کے رہنما اور ان کے اخبارات مسلسل جماعتی سرگرمیوں کی بحالی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اخوان کے سابق مکتبِ ارشاد (عاملہ) کے رکن عمر تلمسانی نے ایک مضمون میں صاف لکھا ہے کہ" ملت اسلامیہ کی پیشرفت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ" اخوان" کو قانونی طور پر بحال کیا جائے، تاکہ اخوان رہنما اور کارکن فوراً معاشرے میں پھیلیں اور اسلام کا پیغام عام کریں اور مسلمانوں کے دلوں میں دین کی بنیادوں کو مضبوط کریں۔ اور اگر موجودہ خلاء کو پُر نہ کیا گیا تو فسادِ کبیر پھیل جانے کا اندیشہ ہے"۔ اخلاقی اور دینی لحاظ سے اس وقت اخوان مصر میں اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی عظمتِ کردار اور ثابت قدمی نوجوان نسل پر اثر انداز ہو رہی ہے، اس لیے امید ہے کہ اگر اخوان بحیثیت جماعت بحال ہو گئے تو تھوڑی ہی مدت کے اندر عوامی طاقت بن جائیں گے۔

اسلامی ذہن وفکر رکھنے والے نوجوانوں نے تعلیمی اداروں کے اندر کام کا ایک اور راستہ نکال لیا ہے۔ انہوں نے " الجماعۃ الاسلامیہ" کے نام سے قاہرہ یونیورسٹی، اسکندریہ یونیورسٹی، عین شمس یونیورسٹی اور دیگر یونیورسٹیوں میں حلقے قائم کر لیے ہیں اور اخوان کا لٹریچر اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور دیگر اسلامی رہنماؤں کی تالیفات ان کی ذہنی وفکری غذا ہیں۔ ان حلقوں کی سرگرمیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یونیورسٹیوں میں طلبہ کی یونینوں پر ان حلقوں کا قبضہ ہے۔ ان یونینوں نے تبلیغی و اصلاحی پروگرام جاری کر رکھے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے یونیورسٹیوں کے تمام طلبہ کو عمرہ کرانے کی اسکیم تیار کی ہے اور ہر طالب علم کو ۶۰ مصری پونڈ کے عوض اس پروگرام میں دعوتِ شرکت دی گئی ہے۔ دیہاتیوں اور ضلعی مقامات میں اسلام کی تبلیغ اور تخریبی نظریات کی تردید کے لیے ان کے " قافلے" ازہری طلبہ کی قیادت میں دَورے کر رہے ہیں۔ لڑکیوں کے اندر بھی اسلامی تہذیب کو اپنانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ دورِ اشتراکیت میں اس امر کی انتہائی کوشش کی گئی تھی کہ فلم اور ثقافت کی دنیا سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو مصر کی نئی نسل کے لیے نمونہ بنایا جائے۔ چنانچہ اربابِ طرب و غنا پوری قوم کے ذہن وفکر پر سوار تھے۔ اُم کلثوم کو رمز الوحدۃ (اتحاد کا شعار) کہا جاتا تھا۔ جدید ترین فیشن کے شو، بالوں کے نئے نئے اسٹائل اور رقص وسرود کے مشرقی اور مغربی ڈھنگ لڑکیوں کی دلچسپیوں کے مرکز تھے۔ مگر اب خود لڑکیوں کے اندر ان چیزوں کے خلاف

ردعمل اُبھر رہا ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر ایک مسلمان لیڈی ڈاکٹر نور الصباح نے پردے کے حق میں زوردار آواز بلند کر کے ترقی پسند حلقوں پر ضرب کاری لگا دی۔ مصری پریس میں اس ضرب کے اثرات اس قدر محسوس کیے گئے کہ لیڈی ڈاکٹر کے ایک انٹرویو کے جواب میں اوباش مردوں اور عورتوں کے مسلسل انٹرویو شائع کیے گئے۔ لیڈی ڈاکٹر سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ اُس نے پردے کا یہ تصور کہ عورت کا پورا جسم پوشیدہ رہے کہاں سے لیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ قدیم علماء کے علاوہ جدید دَور کے اسلامی مفکر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اپنی کتابوں (پردہ اور تفسیر سورۂ نور) میں اسے بالوضاحت بیان کیا ہے۔ الدعوۃ مسلسل ایسی باپردہ لڑکیوں کی خبریں چھاپ رہا ہے جو آزاد خیال اور آوارہ مزاج لڑکیوں کی بدولت زیادہ اچھے نمبر لے کر پاس ہو رہی ہیں۔

خیر و شر کی یہ کشمکش آئندہ کیا نتیجہ پیدا کرے گی، اس کے بارے میں تو کوئی اندازہ لگانا سردست مشکل ہے۔ لیکن خود سرکاری حلقوں میں اس کشمکش کا آغاز ہو چکا ہے۔ مصر کے وزیر اوقاف شیخ محمد حسین الذہبی (مصنف "التفسیر والمفسرون") نے ایک بیان میں اس بات پر رنجیدگی کا اظہار کیا ہے کہ "مسجد کے ذریعہ جو کچھ بنایا جا رہا ہے ٹیلی ویژن کے ذریعے اُسے ڈھایا جا رہا ہے"۔ وزیر تعلیم نے بھی کھلم کھلا ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ "ہم تعلیم گاہوں کے اندر جو اخلاقی عمارت پیدا کرتے ہیں ابلاغ کے ذرائع اُسے منہدم کر دیتے ہیں"۔ اس کشمکش پر تبصرہ کرتے ہوئے الدعوۃ کا اداریہ نویس لکھتا ہے:

> "آج نوجوان نسل صحیح راستے پر گامزن ہو رہی ہے۔ یونیورسٹیوں کو اپنے فرض کا احساس ہو رہا ہے، اور وہ اب اُسی کردار کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کر رہی ہیں جو ماضی قریب میں اُس نے اختیار کیا تھا۔ سویز کے ساحل پر افرنگیوں کے حملوں کا جواب دینے کے لیے یونیورسٹیوں کے طلبہ نے ہی جہاد کے دستوں کی قیادت کی تھی۔ اور حق اور ناموس کے تحفظ کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ ہماری قوم کی نوخیز بچیاں بھی اپنی خودی کو پہچان چکی ہیں، اور نہ صرف اسلام کا نعرہ لگا رہی ہیں بلکہ اسلامی عادات کی عملاً پابندی کر رہی ہیں، اور اسلامی اقدار پر قائم ہو چکی ہیں۔ عوام کے اندر ایک زبردست لہر اُٹھ کھڑی ہوئی ہے جس کا مقصد دین کی طرف رجوع، شریعت اسلامی کا احیاء اور جہاد کا قیام ہے۔ اس لہر کو تسلیم کر لینا امر ناگزیر ہے۔ حکام کا فرض ہے کہ وہ اس عوامی خواہش کو پورا کریں۔ علمبردارانِ حق کا فرض ہے کہ وہ اس جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ محنت اور سنجیدگی کو اپنائیں اور اپنی عملی زندگی کو دوسروں

کے لیے نمونہ بنا کر پیش کریں۔ اور حکمران اور عوام دونوں یہ اعلان کریں کہ انہیں اسلام کے جھنڈے کے سوا کسی جھنڈے کی ضرورت نہیں ہے، اور سب کا ایک ہی نعرہ ہو کہ اللہ غایتنا (اللہ کی رضا ہمارا نصب العین ہے)، القرآن دستورنا (قرآن ہمارا دستورِ حیات ہے) والنبی اِمامنا (اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے قائد ہیں)۔ ماسکو، واشنگٹن، لندن اور پیرس کے "محتاج" سے ہم عرض کریں گے کہ سراب کے پیچھے کب تک دوڑتے رہو گے؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کعبہ صرف مکہ ہی میں ہے، حج صرف بیت اللہ کا کیا جا سکتا ہے اور راہِ حجاز ہی فلاح و سعادت کی راہ ہے۔"

اس وقت مصر میں سب سے زیادہ آواز اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے اُٹھائی جا رہی ہے۔ اس آواز کو بلند کرنے والی بھی زیادہ تر نئی نسل ہے۔ تقریباً ہر طبقۂ خیال کے لوگ اس کی تائید کر چکے ہیں۔ مصری پارلیمنٹ میں یہی موضوع بار بار زیرِ بحث آ رہا ہے۔ مصریوں نے عفریتِ اشتراکیت کے عہد میں جو روح فرسا حالات دیکھے ہیں، اور قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کا جو طوفانِ بدتمیزی مشاہدہ کیا ہے اُس کی وجہ سے اُن کے اندر یہ خواہش شدت کے ساتھ اُبھر آئی ہے کہ ملک میں اسلامی قانون نافذ ہو۔ قانون اور عدلیہ کے لوگ تو ایک مہم کے طور پر اسلامی قانون کی تنفیذ کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ مصری پارلیمنٹ میں مصر کے ایک نامور قانون دان اور رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر اسماعیل معتوق نے اسلامی قانونِ قصاص و تعزیر کے نام سے ایک ترمیمی بل پیش کر رکھا ہے۔ یہ بل مصر کے موجودہ قانونِ تعزیر کے اندر شریعت اسلامی کے مطابق تبدیلی کرنے کے لیے ۵۶ دفعات پر مشتمل ہے۔ اس بل کی تیاری میں ازہر کے علماء، سپریم کورٹ کے وکلاء اور مختلف قانون دانوں سے مدد لی گئی ہے۔ جب یہ بل پیش کیا گیا تو اس پر مصر بھر میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ہر محفل اور ہر تقریب میں اس کی حمایت کی گئی، پارلیمنٹ کا بینہ اور قصرِ صدارت کے نام ملک کے کونے کونے سے تاروں اور خطوط کی بارش ہونے لگی جن میں اس بل کی حمایت کی گئی۔ بلکہ پارلیمنٹ کے ارکان کی اکثریت اس بل کی حمایت میں دستخط بھی کر چکی ہے۔ خود حکومت کی طرف سے اسلامی قانون کی تدوین کے لیے ججوں اور علماء پر مشتمل کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئی ہیں جو مقررہ وقت کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرنے کی پابند ہیں۔

ایک طرف یہ حوصلہ افزا حالات ہیں، اور دوسری طرف مصر کا بے دین اور ملحد عنصر بھی خاموش نہیں ہے۔ بقول شیخ الازہر:

"اس عوامی خواہش کے مقابلے میں بعض افراد یہ چہ میگوئیاں بھی کر رہے ہیں کہ کیا آج کے دور میں

بھی اسلامی حدود قائم کی جا سکتی ہیں؟ کیا یہ بات درست ہو گی کہ ہم پھر اُس دَور کی طرف لوٹ جائیں جب چور کے ہاتھ کاٹے جاتے تھے، زانی کو سنگسار کیا جاتا تھا اور ڈاکوؤں کو پھانسی دی جاتی تھی؟ یورپ کی حکومتیں تو سزائے موت ختم کر کے صرف جیلوں پر اکتفا کر رہی ہیں۔ جدید تمدن نے جو طریقے ختم کر دیے ہیں اب ہم اسے کیسے اپنا سکتے ہیں؟ کچھ دوسرے لوگ یہ کہتے سُنے گئے ہیں کہ ہمارا اقتصادی نظام بہت پیچیدہ ہے۔ اس کی اساس بینکنگ پر ہے۔ اور تمام معاملات سود کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ کیا اس نظام کا کوئی متبادل ہمارے پاس ہے؟"

شیخ الازہر نے یہ اعتراض نقل کرنے کے بعد اس کے ہر پہلو کا مفصل جواب دیا ہے اور مصری قانون کی تاریخ بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ جب سے مصر میں غیر اسلامی قوانین کا نفاذ شروع ہوا ہے عدل وانصاف اور امن وسکون کی فضا مفقود رہی ہے۔ بہرحال یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ پوری مصری قوم اس وقت اسلامی قانون کے لیے بیتاب ہے البتہ حکمران گروہ کے کچھ افراد اس راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔ بعض مصری حلقے یہ بھی اشارہ کر رہے ہیں کہ مصر میں اسلامی روح کی بیداری سے اسرائیل پریشان ہے۔ مصر کا خفیہ کمیونسٹ گروہ بھی شدید مخالفت کر رہا ہے اور حالات کو خراب کرنے کے لیے طرح طرح کی سازشیں گھڑ رہا ہے۔

ڈاکٹر اسماعیل معتوق کا ترمیمی بل پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔ اور جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا ہے اس کی حمایت میں ارکان کی اکثریت دستخط کر چکی ہے۔ ستمبر کے اجلاس میں جب اس پر بحث کرنے کا وقت آیا تو وزیرِ قانون نے کوشش کر کے اُسے اگلے اجلاس تک ملتوی کرا دیا۔ مصر کی اندرونی فضا میں اس وقت اسلامی قانون کے حق میں جو جوش وخروش پایا جاتا ہے اُس کے پیشِ نظر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مصر کا حکمران گروہ اس مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ حکومتِ مصر کی طرف سے چند ماہ پیشتر شراب پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ یہ بھی عوامی مطالبے کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ مگر عوام اس پابندی پر بھی خوش نہیں ہیں کیونکہ یہ پابندی ہمہ گیر نہیں ہے۔ اس کی رُو سے صرف پبلک اجتماعات کے مواقع پر شراب نوشی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مصر کے کلب اور ہوٹل اور سیاحوں کے اڈے اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔

اسلامی قانون کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے کہا ہے کہ "میں اس نظریے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اسلامی قانون کے نفاذ سے پہلے مسلمان افراد تیار کیے جائیں۔ یہ نظریہ امرِ معکوس ہے۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے جب اسلامی شریعت کا نفاذ کیا تھا تو انھوں نے فضا اور

ماحول کو ہموار کرنے کا انتظار نہیں کیا تھا بلکہ یک قلم اسلامی شریعت نافذ کر دی تھی۔ چنانچہ وہ ملک جہاں امن و سکون غارت ہو چکا تھا تھوڑے سے ہی عرصہ کے اندر گہوارۂ امن بن گیا۔ قطعِ ید کی سزا پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پورے سعودی عرب میں ۴۰ سال کے اندر چوری کے جرم میں صرف دس افراد کے ہاتھ کٹے ہیں۔ اور اب چوری وہاں ناپید ہو چکی ہے۔ شیخ الازہر نے اس امر پر بھی اظہار افسوس کیا کہ مصر کے کالجوں میں جو نظام تعلیم جاری ہے وہ استعمار کا وضع کردہ ہے اور اس میں آزاد قوم کے شایانِ شان نوجوان تیار نہیں کیے جاتے۔ انہوں نے بتایا کہ لاء کالج میں ہفتے کے ۲۲ لیکچروں میں سے ۲۰ لیکچر مغربی قانون پر ہوتے ہیں اور صرف ۲ لیکچر اسلامی قانون کے موضوع پر۔ مصر کے وزیر اوقاف ڈاکٹر محمد حسین الذہبی نے کہا ہے کہ اس وقت ملک کی فضا اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے نہایت موزوں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت اسلامی قانون کا نفاذ مصر کی قومی ضرورت ہے۔ گذشتہ مہینے قاہرہ میں معاشرتی تحقیقات کے قومی مرکز میں ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کی گئی جس میں ازہر کے نمائندے، اسلامیات کے اساتذہ، پولیس کے افسران عدالتوں کے جج اور دیگر سرکاری افسران شریک ہوئے۔ انہوں نے اسلامی قانون کے نفاذ پر مکمل اتفاق کا اظہار کیا اور وزیر قانون کے اس بیان پر تنقید کی کہ اسلامی قانون صرف مسلمانوں پر نافذ ہوگا غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

رسائل و مسائل

تفہیم القرآن کے چند مقامات پر اعتراضات

ہمارے پاس تفہیم القرآن کے بعض مقامات پر کچھ اعتراضات آئے ہیں جنہیں ہم نے اُسی غائر نظر سے دیکھا جس کے وہ مستحق تھے۔ ذیل میں ہم ایک ایک اعتراض کو نقل کر کے اس پر بحث کریں گے۔

۱۔ سورۂ یوسف، آیت ۳

" نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ۔

" "القصص" یہاں مصدر کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ مصدر عربی کے معروف قاعدے کے مطابق تکرہ آنا چاہیے۔ "احسن القصص" " احسن الحدیث" کی نوعیت کی ترکیب ہے اور "قصص" یہاں بمعنی "مقصوص" استعمال ہوا ہے۔ لفظ کا یہ استعمال عربیت کے مطابق ہے۔ قَصَّ يَقُصُّ، مفعول کی طرف مُتَعَدِّی ہوتا ہے اور قرآن میں یہ ہر جگہ مفعول ہی کے طور پر استعمال ہوا ہے بنا بریں صحیح ترجمہ ہوگا۔

" ہم تمہیں بہترین سرگزشت سناتے ہیں"

لسان العرب میں " نَحْنُ نُبَيِّنُ لَكَ أَحْسَنَ الْبَيَانِ" کا فقرہ بھی اسی ترجمہ کی تائید کرتا ہے۔ اس لیے کہ " بیان " کا لفظ یہاں اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے، مصدر کے طور پر استعمال نہیں ہوا"۔

تفہیم القرآن میں اس آیت کی ترجمانی اِن الفاظ میں کی گئی ہے: " ہم بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں"۔ اگر اس آیت کا لفظی ترجمہ کیا جاتا تو عبارت یہ ہوتی کہ " ہم تم سے بیان کرتے ہیں بہترین پیرائے میں بیان کرنا"۔ لیکن یہ اُردو زبان کے لیے ایک نامانوس اُسلوب ہوتا، اس لیے ہم نے " قصہ بیان کرنے" اور " بہترین پیرائے میں بیان کرنے" کے مفہومات کو اُردو زبان کے محاورے کے مطابق ادا کیا ہے۔ اب قبل اس کے کہ اس پر قواعدِ زبان کے لحاظ سے بحث کی جائے، یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اکابر اہلِ علم نے

اس آیت کا کیا ترجمہ کیا ہے:

شاہ ولی اللہ صاحب: "ما قصہ می خوانیم بر تو بہترین قصہ خواندن"۔

شاہ رفیع الدین صاحب: "ہم بیان کرتے ہیں اوپر تیرے بہت اچھی طرح بیان کرنا"۔

شاہ عبدالقادر صاحب: "ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہتر بیان"۔

مولانا اشرف علی صاحب: "ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں"۔

پہلے دونوں بزرگوں نے ٹھیک وہی کام کیا ہے جو آپ کے نزدیک غلط ہے، یعنی انھوں نے اَلْقَصَص کو مصدر کے معنی میں لے کر "قصہ خواندن" اور "بیان کرنا" اس کا ترجمہ کیا ہے۔ البتہ دوسرے دو بزرگوں نے اسے اسم قرار دے کر اس کا ترجمہ "بیان" اور "قصہ" کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عربی زبان میں دونوں تعبیرات کی گنجایش ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کے بارے میں مشکل ہی سے کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ وہ عربی کے معروف قاعدوں سے ناواقف تھے۔

اب قواعدِ زبان کے لحاظ سے دیکھیے۔ زَمَخشری کہتے ہیں کہ القَصَص مصدر بھی ہوسکتا ہے اِقْتِصاص (قصہ بیان کرنے) کے معنی میں۔ اور فعل بمعنی مفعول بھی ہوسکتا ہے، جیسے الخَبَر سے مراد وہ بات ہے جس کی خبر دی گئی ہو۔ اور جائز ہے کہ مفعول کو مصدر کے نام سے موسوم کیا جائے جیسے مخلوق کا نام خَلق۔ اب اگر القصص کو مصدر کے معنی میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ نحن نقص علیک احسن الاقتصاص (ہم بیان کرتے ہیں تم سے بہترین بیان کرنا)۔ اور اگر القصص سے مَقْصُوص (بیان کی ہوئی چیز) مراد ہو تو اس کے معنی ہوں گے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ مَا يُقَصُّ مِنَ الْأَحَادِيثِ (ہم بیان کرتے ہیں تم سے وہ چیز جو بہترین ہے اُن باتوں میں سے جو بیان کی جاتی ہیں)۔

یہی بات امام رازی نے بھی کہی ہے اور اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اگر قَصَص کو اِقتِصاص کے معنی میں مصدر مانا جائے تو لفظ احسن جس خوبی کے لیے استعمال ہوا ہے وہ حُسنِ بیان کی طرف راجع ہوگی نہ کہ قصے کی طرف، یعنی اُس کا مطلب ہوگا بہترین طریقے سے بیان کرنا، نہ کہ بہترین قصہ۔ اور اگر قَصَص کو مَقْصُوص (بیان کردہ بات) کے معنی میں لیا جائے تو یہ خوبی اُس قصے کی ہوگی جو بیان کیا گیا ہے۔

علامہ آلوسی نے قَصَص کو مصدر اور اِقتِصاص کا ہم معنی قرار دیتے ہوئے ایک نکتے کا اور اضافہ کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس جملے میں اَحْسَنَ الْقَصَصِ، نَقُصُّ کا مفعول نہیں ہے بلکہ اُس کا مفعول محذوف ہے،

اور وہ ہے اِس سورت کا مضمون ۔ اِسی بنا پر ہم نے اُس محذوف مُتَعَلَّق کو "واقعات اور حقائق" کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

۲۔ سورۂ مومنون آیت ۶۷

"مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ۔

اِستکبار کے بعد "بِ" اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہ لفظ یہاں استہزا کے مفہوم پر مُتَضَمِّن ہے۔ عربی میں جب "صِلَہ" لفظ کے ساتھ مناسبت نہ رکھتا ہو تو مناسب لفظ محذوف ہوتا ہے، جیسے "فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ"۔ صَبَرَ یَصْبِرُ کے ساتھ "ل" کا صِلہ مناسبت نہیں رکھتا، اِس لیے پورا جملہ ہوگا "فَاصْبِرْ وَانْتَظِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ"۔ "خَلَا" کے ساتھ "اِلٰی" مناسبت نہیں رکھتا، اس لیے تقدیرِ جملہ ہوگی اِذَا خَلَوْا وَذَهَبُوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ۔" لفظ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ کا مفعول بھی ہو سکتا ہے، اور اگر اس کو بِهٖ کی ضمیر مجرور سے حال مانیں جب بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔

"تَهْجُرُوْنَ، (تم چھوڑتے ہو) اپنے معروف معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ترجمہ: گھمنڈ کرتے ہوئے گویا کسی افسانہ گو کو چھوڑ رہے ہو۔"

اِس بحث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ جس سلسلہ بیان میں یہ فقرہ آیا ہے اُسے نگاہ میں رکھا جائے۔ پورا مضمون یہ ہے قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ (آیات ۶۶ - ۶۷)

تفہیم القرآن میں اِن آیتوں کی ترجمانی اِس طرح کی گئی ہے:

"میری آیات سنائی جاتی تھیں تو تم (رسول کی آواز سنتے ہی) اُلٹے پاؤں بھاگ نکلتے تھے، اپنے گھمنڈ میں اُس کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے، اپنی چوپالوں میں اُس پر باتیں چھانٹتے اور بکواس کرتے تھے۔"

دوسرے اکابر اہلِ علم کے ترجمے یہ ہیں:

شاہ ولی اللہ صاحب: "ہر آئینہ خواندہ می شد آیاتِ ما بر شما پس شما بر پاشنہائے خود باز می گشتید تکبر کناں بہ آں قرآن، بافسانہ مشغول شدہ ترک می کردید۔"

شاہ رفیع الدین صاحب: "تحقیق تھیں آیتیں میری کہ پڑھی جاتی تھیں اُوپر تمہارے، پس تھے تم اُوپر اپنی ایڑیوں کے پھر جاتے تکبّر کرتے ہوئے ساتھ اُس کے، افسانہ گوئی کرتے ہوئے بیہودہ بکتے تھے۔"

شاہ عبدالقادر صاحب: "تم کو سنائی جاتی تھیں میری آیتیں تو تم ایڑیوں پر اُلٹے بھاگتے تھے۔ اُس سے بڑائی کر کر ایک کہانی والے کو چھوڑ کر چلے گئے۔"

مولانا اشرف علی صاحب: "میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر (رسول کی زبانی) سُنائی جایا کرتی تھیں، تو تم اُلٹے پاؤں بھاگ گئے تھے، تکبّر کرتے ہوئے، قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے (اِس قرآن کی شان میں) بیہودہ بکتے ہوئے۔"

تفہیم القرآن میں مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ کی ضمیر آیات سُنانے والے رسول کی طرف پھیری گئی ہے، اور اُس کے ساتھ استکبار کرنے (یعنی گھمنڈ کرنے) میں عدمِ اعتنا کو مُقدّر مان کر اُس کا مفہوم "خاطر میں نہ لانے" سے ادا کیا گیا ہے۔ سَمَر کو عربی محاورے کے مطابق راتوں کی افسانہ گوئی اور گپ بازی کے معنی میں لیا گیا ہے جو ہر قبیلے کی چوپال میں ہوا کرتی تھی۔ اور تَهْجُرُوْنَ کو ہذیان اور بدگوئی کے معنی میں لیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے دونوں صاحبزادوں اور مولانا اشرف علی صاحب نے بِهٖ کی ضمیر قرآن یا اس کے سنانے والے رسول کی طرف پھیری ہے۔ آگے کے مضمون میں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب نے سامرًا کا مفہوم بافسانہ مشغول شدن، افسانہ گوئی کرنے اور قرآن کا مشغلہ بنانے سے ادا کیا ہے، اور صرف شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ کفارِ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامر (کہانی والا) قرار دیتے تھے۔ تَهْجُرُوْنَ کو شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب نے ترک کرنے اور چھوڑ دینے کے معنی میں، اور شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب نے بیہودہ بکواس کے معنی میں لیا ہے۔ اب دیکھیے کہ اکابرِ مُفسّرین ان آیتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ابن جریر کہتے ہیں کہ سَمَر سے مراد رات کے وقت افسانہ گوئی کرنا ہے، اور تَهْجُرُوْنَ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لوگ قرآن یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے رُخی کرتے اور آپ کو چھوڑ دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہذیان بکتے تھے۔ اس کے بعد صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن عباس نے تَهْجُرُوْنَ کا مطلب اللہ کے ذکر اور حق کو چھوڑ

دینا بیان کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر کے نزدیک سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ کی تفسیر "راتوں کی افسانہ گوئی اور خلافِ حق باتوں میں انہماک" ہے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ تَهْجُرُوْنَ سے مراد قرآن کے بارے میں بدگوئی ہے اور ابن زید کے نزدیک یہ لفظ ہذیان کے معنی میں ہے۔

زمخشری مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ (۱) بِهٖ کی ضمیر کا مرجع آیاتی بمعنی کتابی بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں قرآن سے استکبار کرنے کا مطلب یا تو یہ ہوگا کہ وہ تکبر کرتے ہوئے اس کی تکذیب کرتے ہیں، یا پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن سن کر ان پر غرور اور سرکشی کا دورہ پڑ جاتا ہے اور اس لحاظ سے وہ قرآن کے ساتھ اِستکبار کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (۲) بِهٖ کا تعلق سامرًا سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنی راتوں کی مجلسوں میں قرآن کا ذکر کرتے ہوئے اس پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ کفارِ قریش کا معمول یہ تھا کہ وہ راتوں کو بیت اللہ کے ارد گرد مجلسیں جما کر بیٹھ جاتے تھے اور اپنا وقت زیادہ تر قرآن کے خلاف باتیں چھانٹنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سبّ و شتم کرنے میں صرف کرتے تھے۔ (۳) بِهٖ کا تعلق تَهْجُرُوْنَ سے بھی ہو سکتا ہے جو اگر ہُجر سے مشتق ہو تو اس کے معنی فحش گوئی کے ہیں، اور ہَجر سے مشتق ہو تو اس کے معنی ہذیان بکنے کے ہیں۔

امام رازی اور بیضاوی کی تفسیر زمخشری اور ابن جریر کی تفسیر سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

آلوسی کہتے ہیں کہ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ میں (ب) یا تو تعدیہ کے لیے ہے تاکہ استکبار میں ضمناً تکذیب کا مفہوم شامل ہو جائے، یا سببیّت کے لیے ہے، کیونکہ کفار کے اندر استکبار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سبب سے ظاہر ہوا تھا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع قرآن ہو جس پر لفظ آیات دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا تعلق سَامِرًا سے ہو اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنی راتوں کی گفتگوؤں میں قرآن کے خلاف طعن کرتے تھے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ تَهْجُرُوْنَ هَجْر سے مشتق ہے جس کے معنی چھوڑ دینے اور تعلق توڑ دینے کے ہیں، اور یہ حال کے طور پر یہاں لایا گیا ہے اس معنی میں کہ وہ حق کو، یا قرآن کو، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑتے ہوئے ایسا کرتے ہیں۔ نیز ہَجر کے معنی ہذیان کے بھی ہیں اور اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ قرآن یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہذیان بکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تُهْجِرُوْنَ ہُجر سے ہو جس کے معنی کلامِ قبیح کے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تفہیم القرآن کی ترجمانی اور دوسرے مترجمین کے ترجموں میں سے کسی پر بھی وہ اعتراض وارد نہیں ہوتا جو معترض نے کیا ہے۔

۳۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۲

"وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ"

اس کا صحیح ترجمہ ہوگا "اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔" عربی میں مبالغہ پر نفی آئے تو اس سے مقصود "مبالغہ فی النّفی" ہوگا۔

یہ کوئی قاعدۂ کلیہ نہیں ہے کہ جب بھی مبالغہ پر نفی آئے تو وہ مبالغہ فی النّفی کے معنی میں ہوگی۔ ظلّام کے معنی ہیں بہت بڑا ظلم کرنے والا۔ یہ لفظ جب نفی کے ساتھ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ فلاں شخص مطلق ظلم کرنے والا نہیں ہے، بلکہ یہ ہوگا کہ وہ بڑا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اور سننے والا اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ وہ کسی نہ کسی حد تک تو ضرور ظلم کر گزرتا ہے۔ اسی لیے تفہیم القرآن میں اس جملے کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ "اللہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے"۔ اور یہی ترجمہ دوسرے مترجمین نے بھی کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ یہ ہے: "خدا ستم کنندہ نیست بہ بندگان"۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ یہ ہے: "اللہ نہیں ظلم کرنے والا واسطے بندوں کے"۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے: "اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر" اور مولانا اشرف علی صاحب اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں: "اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں"۔ اس طرح ظلم کی نفی سے ظلّام کی نفی آپ سے آپ ہو جاتی ہے اور کسی مبالغہ فی النفی کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ جو ظالم نہیں ہے وہ آخر بہت بڑا ظالم کیسے ہو جائے گا۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت ہی میں نہیں بلکہ دوسری متعدد آیات میں اپنے ظالم ہونے کی نفی کے بجائے ظلّام ہونے کی نفی اس لیے کی ہے کہ خالق اگر اپنے بندوں کو بے قصور عذاب دے تو وہ معمولی ظالم نہیں بلکہ بہت بڑا ظالم ہوگا۔ پس یہ بات ارشاد فرما کر وہ یہ حقیقت اپنے بندوں کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ جو خدا اُن کا پیدا کرنے والا اور اُن کی پرورش کرنے والا ہے وہ انھیں عذاب اُسی صورت میں دیتا ہے جب وہ طغیان و سرکشی میں حد سے گزر جاتے ہیں اور اپنے کرتوتوں سے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بنا لیتے ہیں۔ ورنہ خالق اور رب اپنی مخلوق کے حق میں رحیم ہی ہو سکتا ہے، ظالم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

۴۔ سورۂ حج، آیت ۱۵

"ثُمَّ لْیَقْطَعْ"

لِیَقْطَعْ" یہاں عزم و جزم کے ساتھ کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے کے مفہوم میں ہے۔

(سورۂ نمل ۔ ۳۲) میں ہے قَالَتْ یٰٓاَیُّھَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْٓ اَمْرِیْ، مَا کُنْتُ قَاطِعَۃً اَمْرًا حَتّٰی تَشْھَدُوْنِ ۔ یعنی میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک آپ لوگ موجود ہو کر مشورہ نہ دیں۔ لہٰذا پورا جملہ یہ ہوگا:

اُسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچے پھر اپنے معاملہ کا فیصلہ کرلے، پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر اس کے غم کو دُور کر سکتی ہے۔"

یہ بات قطعاً غلط ہے کہ عربی زبان میں لفظ قَطْع کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔ لُغت کی کسی کتاب سے اِس کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس میں قَاطِعَۃً اَمْرًا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قطع کا لفظ اَمر کے ساتھ تو بے شک عربی محاورے میں کسی معاملے کا فیصلہ کرنے کے معنی دیتا ہے، لیکن محض قطع سے یہ مفہوم ہرگز نہیں نکلتا۔ یہ ایسی ہی تاویل ہے جیسے بعض لوگوں نے دیکھا کہ ضَرْبٌ فِی الْاَرْضِ کے معنی زمین میں چلنے اور سفر کرنے کے ہیں تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ محض لفظ ضرب کے معنی بھی یہی ہیں، اور فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ کا مطلب یہ لے لیا کہ ہم نے موسیٰؑ سے کہا اپنا عصا لے کر چٹان پر چڑھ جا۔

سورۂ حج میں یہ لفظ جس آیت میں وارد ہوا ہے وہ ایک سلسلۂ بیان کا حصّہ ہے جو رکوع ۲ کے آغاز سے چلا آ رہا ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ لوگوں میں سے کوئی تو ایسا ہے جو حق و باطل کی سرحد پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اگر اُسے فائدہ حاصل ہوا تو مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی آفت آ گئی تو اُلٹا پھر جاتا ہے اور ایک ایک آستانے پر ماتھا رگڑنے لگتا ہے جہاں کسی کے پاس بھی نفع یا نقصان پہنچانے کے اختیارات نہیں ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ ایمان لانے اور نیک عمل کرتے ہیں، اللہ ان کو ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ درحقیقت یہ اختیار اللہ ہی کا ہے کہ جو کچھ چاہے کرے۔ اس کے بعد فرمایا گیا:

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ۔

تفہیم القرآن میں اِس کی ترجمانی اِس طرح کی گئی ہے: "جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اُس کی کوئی مدد نہ کرے گا اُسے چاہیے کہ ایک رسّی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے، پھر دیکھ لے کہ آیا اُس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کرسکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے"۔ اس میں گمان کرنے والے شخص سے مراد وہی شخص لیا گیا ہے جو کنارے پر رہ کر خدا کی عبادت کرتا ہے، اور اُسی کا یہ گمان قرار دیا گیا ہے کہ اللہ اس کی کوئی مدد نہ کرے گا۔ اِس کے بعد آگے کے مضمون کا یہ مطلب خود واضح ہو جاتا ہے کہ آستانوں پر جانا تو درکنار، اگر ہوسکے تو آسمان تک پہنچ کر اُس میں شگاف ڈال کے بھی دیکھ لے، کیا خدا کی جو تقدیر اُسے ناگوار ہے اُسے وہ بدل سکتا ہے؟

اب یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اکابر علما کے ترجموں میں سے کسی میں بھی ثُمَّ لْيَقْطَعْ کا وہ مفہوم نہیں لیا گیا ہے جو آپ لے رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ یہ ہے: "پس باید کہ بیاویزد رَسَنے بجانبِ بالا، باز باید کہ خفہ شود پس درنگرد آیا دور می کند این تدبیرِ او چیزے راکہ بخشم آوردہ"۔

شاہ رفیع الدین صاحب: "پس چاہیے کہ کھینچ لے جاوے ایک رسّی طرف آسمان کے، پھر چاہیے کہ کاٹ ڈالے، پھر دیکھے کیا لے جاوے گا مکر اُس کا اُس چیز کو کہ غصے میں لاتی ہے اُسے"۔

شاہ عبدالقادر صاحب: "تو تانے ایک رسّی آسمان کو، پھر کاٹ ڈالے، اب دیکھے کچھ گیا اُس کی تدبیر سے اُس کے جی کا غصہ"۔

مولانا اشرف علی صاحب: "تو اُس کو چاہیے کہ ایک رسّی آسمان تک تان لے، پھر (اُس کے ذریعہ سے آسمان پر پہنچ کر اگر ہوسکے) اِس وحی کو موقوف کرا دے۔ تو پھر اب غور کرنا چاہیے آیا اُس کی یہ تدبیر اُس کی ناگواری کی چیز کو (یعنی وحی کو) موقوف کرسکتی ہے"۔

مفسرین کے جو اقوال امام رازی اور علامہ آلوسی نے نقل کیے ہیں وہ بھی دیکھ لیجیے:

ا۔ مسلمانوں میں سے ایک گروہ مشرکین کے خلاف اپنی شدتِ غیظ کی بنا پر اللہ کی طرف سے اپنے رسولؐ اور اپنے دین کی مدد آنے میں دیر لگتی دیکھ کر سخت بے چین ہو رہا تھا۔ اِس پر فرمایا گیا کہ جو شخص یہ گمان رکھتا

ہے کہ اللہ اپنے رسولؐ کی مدد نہ کرے گا، وہ بڑی سے بڑی کوشش کر کے دیکھ لے، حتیٰ کہ آسمان تک کسی رسّی کے ذریعے سے قطعِ مسافت کر سکتا ہو تو وہ بھی کر دیکھے، کیا اس کی یہ تدبیر خدا کی طرف سے نُصرت آنے میں اس تاخیر کو رفع کر سکتی ہے جس پر وہ غیظ میں مبتلا ہے۔

۲۔ کفار یہ سمجھتے تھے کہ اللہ اپنے رسولؐ کی مدد نہ کرے گا اس لیے ان سے یہ کہا گیا کہ کسی رسّی کے ذریعہ سے آسمان تک قطعِ مسافت کر سکتے ہو تو وہ بھی کر کے دیکھ لو، کیا تم رسولؐ کے لیے اللہ کی مدد آنے کو روک سکتے ہو جس پر تم جل بھن رہے ہو۔

۳۔ یہ مطلب بھی اس آیت کا لیا گیا ہے کہ اگر بن پڑے تو آسمان تک پہنچ کر رسولؐ پر وحی آنے کا سلسلہ منقطع کرنے کی کوشش کر دیکھو جس کا آنا تمہیں سخت ناگوار ہے۔

۴۔ بعض مفسرین نے آسمان سے مراد مکان کی چھت لی ہے، اور آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ جو شخص دُنیا اور آخرت میں اللہ سے مدد کی اُمید نہیں رکھتا اسے چاہیے کہ اپنے گھر کی چھت سے رسّی لٹکا کر پھانسی لے لے اور دیکھے کہ آیا اس طریقے سے اس کا وہ غیظ دُور ہو سکتا ہے جو اللہ سے مدد نہ ملنے پر اسے لاحق ہے۔ اس قول کے قائلین قطع سے مراد سانس کی آمد و رفت کے راستے منقطع کر دینا لیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مفسرین میں سے کسی نے بھی قطع سے مراد فیصلہ کرنا نہیں لیا ہے بلکہ سب اسے حقیقی یا مجازی طور پر کاٹنے ہی کے معنی میں لیتے ہیں۔

۵۔ سورۂ انفال آیات ۶۷ تا ۶۹

"مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ، تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ، لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ، فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ، وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔"

عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے، نبی کے لیے زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خونریزی نہ کر لے۔

اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے " اِثخان فِی الْاَرض " کے الفاظ قطعی طور پر مناسب نہیں ہیں۔

اگر یہی بات کہنا ہوتی تو " حَتّٰى يُثْخِنَهُمْ " کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔

" لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ " کے الفاظ بھی قرآنِ حکیم میں بالعموم کفار کے لیے اِمہال کی سنتِ الٰہیہ کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں اور واقعہ یہی ہے کہ بدر میں " اِثخان " کچھ کم نہیں ہوا تھا۔

فِيْمَآ اَخَذْتُمْ اس طرح کے اسلوب میں، روش اختیار کرنے، طریقہ اپنانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

آیات کا پس منظر یہ ہے کہ بدر کے بعد جب فدیہ پر معاملہ ہوا تو قریش نے پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ یہ تو بس دنیا کے طالب ہیں۔ یہ جنگ وجدال حق کی خاطر نہیں، مالِ غنیمت سمیٹنے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ قیدیوں کو پکڑا ہے تو اب انھیں بھی فدیہ لے کر چھوڑ رہے ہیں۔ نبوت کا تو بس ادعا ہی ہے۔ اصل سوال تو روپے کا درپیش ہے جس کے لیے یہ جتھہ بندی کی گئی ہے۔ اس پروپیگنڈا کی تردید میں ارشاد ہوا:

یہ نبی کا مقام نہیں ہے کہ اُس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ اس کے لیے زمین میں خونریزی کرے۔ (اے قریشِ مکہ) یہ تم ہو جو دنیا کے طالب ہو، اللہ تو بس آخرت کو چاہتا ہے، اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔ اگر اللہ کے ہاں پہلے ہی تمھارے لیے (اِمہال کا) نوشتہ نہ ہوتا تو جو روش تم نے اختیار کی تھی اُس کی پاداش میں تمھیں عذابِ عظیم آ لیتا۔"

سب سے پہلے تو وہ پس منظر ہی غلط ہے جسے بنیاد بنا کر ان آیات کا نیا ترجمہ تجویز کیا گیا ہے۔ اِس امر کا قطعاً کوئی ثبوت حدیث یا تاریخ کی روایات میں موجود نہیں ہے کہ قیدیوں کا فدیہ لینے پر کفارِ قریش نے اُس طرح کا کوئی پروپیگنڈا کیا تھا جو معترض نے بیان کیا ہے اور اس کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ یہ محض ایک خود ساختہ مفروضہ ہے اور آیات قرآنی کی تفسیر ایسے مفروضات کی بنا پر کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اصل پس منظر یہ ہے کہ سورۂ محمد آیت ۴ میں جنگی قیدیوں سے فدیہ لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی گئی تھی کہ کفار سے جب لڑائی ہو تو پہلے اُن کی گردنیں مار مار کر انھیں اچھی طرح کچل دیا جائے۔ پھر قیدی پکڑے جائیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ خواہ ان کے ساتھ احسان کریں یا فدیہ لے لیں۔ اس آیت کے ابتدائی الفاظ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (جب کافروں سے تمھاری مڈبھیڑ ہو) اس بات کو

خود ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ فرمانِ الٰہی اس وقت نازل ہوا تھا جب کفار سے ابھی لڑائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لیے اس کے حکم کا اطلاق سب سے پہلے جنگ بدر پر ہوا۔ جنگِ بدر میں بلاشبہ مجاہدین اسلام نے حمایتِ حق میں جان لڑا کر کفارِ قریش کی تین گنی بڑی قوت کو شکست دے دی تھی، لیکن اِثخان کی شرط پوری طرح ادا کیے بغیر وہ قیدی پکڑنے میں لگ گئے۔ یہ بات حضرت سعدؓ بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اُسی وقت حضورؐ سے عرض کر دی تھی جب وہ حضورؐ کے ساتھ ایک بلند جگہ سے معرکے کو دیکھ رہے تھے۔ مجاہدین کو مالِ غنیمت حاصل کرنے اور قیدی پکڑنے میں مشغول دیکھ کر اُن کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ملاحظہ فرما کر حضورؐ نے ان سے پوچھا "اے سعد، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارروائی تمھیں پسند نہیں آ رہی ہے"۔ انھوں نے عرض کیا جی ہاں یارسول اللہؐ، یہ پہلا موقع ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ شرک کو شکست دلوائی ہے۔ اِس وقت انھیں قیدی بنانے سے بہتر یہ ہوتا کہ انھیں خوب کچل ڈالا جاتا (یعنی افراتفری میں بھاگتے ہوئے کافروں کو زیادہ سے زیادہ قتل کر کے اُن کی طاقت توڑ ڈالی جاتی)۔ اسی بات کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے سورۃ انفال کی اِن آیتوں میں فرما دی۔

اب دیکھیے کہ تفہیم القرآن میں اس کی ترجمانی کس طرح کی گئی ہے اور دوسرے جلیل القدر مترجمین نے ان کا کیا ترجمہ کیا ہے۔

تفہیم القرآن: "کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دُنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اُسے کھاؤ کہ وہ حلال و طیّب ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ درگذر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

شاہ ولی اللہ صاحب: "سزاوار نبود پیغمبر را کہ بدستِ وے اسیران باشند تا آنکہ قتل بسیار بوجود آورد در زمین۔ می خواہید مالِ دُنیا را و خدا می خواہد مصلحتِ آخرت را، و خدا غالب باحکمت است۔ اگر نبودے حکمِ خدا پیشتر گذشتہ می رسید بشما در آنچہ گرفتید عذابِ بزرگ۔ پس بخورید آنچہ غنیمت گرفتید حلال و پاکیزہ۔ و بترسید از خدا، ہر آئینہ خدا آمرزندہ مہربان است"۔

شاہ رفیع الدین صاحب: "نہ تھا لائق واسطے نبی کے یہ کہ ہوویں واسطے اس کے بندیوان، یہاں تک

خونریزی کر لے بیچ زمین کے۔ ارادہ کرتے ہو تم اسبابِ دُنیا کا اور اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اگر نہ ہوتا لکھا ہوا اللہ کی طرف سے کہ پہلے گزرا، البتہ لگتا تم کو بیچ اُس چیز کے کہ لیا تھا تم نے عذاب بڑا۔ پس کھاؤ اُس چیز سے کہ غنیمت لیا ہے تم نے حلال پاکیزہ، اور ڈرو اللہ سے، تحقیق اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

شاہ عبدالقادر صاحب: "کیا چاہیے نبی کو یہ کہ اس کے یہاں قیدی آویں جب تک نہ خون کرے ملک میں؟ تم چاہتے ہو جنس دُنیا کی اور اللہ چاہتا ہے آخرت، اور اللہ زور آور ہے حکمت والا۔ اگر نہ ہوتی ایک بات کہ لکھ چکا اللہ آگے، تو تم کو آ پڑتا اس لینے میں بڑا عذاب۔ سو کھاؤ جو غنیمت لاؤ حلال ستھری، اور ڈرتے رہو اللہ سے، اللہ ہے بخشنے والا مہربان"۔

مولانا اشرف علی صاحب: "نبی کی شان کے لائق نہیں کہ اُن کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خونریزی نہ کر لیں۔ تم تو دنیا کا مال اسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست بڑی حکمت والے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم پہ کوئی بڑی سزا واقع ہوتی۔ سو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کو حلال پاک سمجھ کر کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑے رحمت والے ہیں"۔

دیکھ لیجیے، تفہیم القرآن ہی میں نہیں، باقی سب مستند ترجموں میں بھی اُس نقطۂ نظر کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا جو آپ نے ان آیات کے مفہوم میں اختیار کیا ہے۔ اس کے بعد مفسرین کے اقوال بھی ملاحظہ کر لیجیے۔

ابن جریر: حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ، یعنی جب تک وہ زمین میں مشرکین کو خوب قتل کر کے اور ان کو بزور مغلوب کر لے۔ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ ...... یعنی اے اہل بدر، اگر لوحِ محفوظ میں اللہ کی طرف سے تمھارے لیے فیصلہ پہلے لکھا ہوا نہ ہوتا کہ اللہ تمھارے لیے غنیمت کو حلال کرنے والا ہے ..... تو جو غنیمت اور فدیہ تم نے لیا ہے اس پر تمھیں ایک عذابِ عظیم آ لیتا۔

زمخشری: اثخان کے معنی ہیں کثرتِ قتل اور اس میں مبالغہ ...... مطلب یہ ہے کہ اہل کفر میں خوب قتل جاری کر کے کفر کو ذلیل و ضعیف اور اسلام کو استیلاء و قہر سے غالب اور طاقت ور کر لیا جائے، اس کے بعد قیدی پکڑے جائیں۔

امام رازی: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ زمین میں خوب خونریزی نہ کرلے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قیدی بنانا مشروع تو تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ پہلے زمین میں اِثخان ہولے۔ اور اِثخان سے مراد قتل اور تخویفِ شدید ہے ...... اور یہ بات (سورۂ محمد میں) اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد سے مؤکد ہو جاتی ہے کہ حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۤءً (یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب کچل لو تو پھر قیدیوں کو باندھنا شروع کرو اور اس کے بعد یا تو احسان کرو یا فدیہ لے لو)۔

بیضاوی: لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ، یعنی اگر اللہ کی طرف سے لوحِ محفوظ میں پہلے ہی حکم ثبت نہ ہوچکا ہوتا ...... لَمَسَّكُمْ، یعنی تم کو آ لیتا۔ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ، یعنی اُس فدیہ کی پاداش میں جو تم نے لیا۔

آلوسی: ثخانت کے اصل معنی اجسام میں گاڑھے اور دبیز ہونے کے ہیں۔ پھر استعارے کے طور پر یہ لفظ قتل و جراحت میں مبالغہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی حرکت سے روک دیتا ہے اور مقتول و مجروح کو اُس گاڑھی چیز کی طرح کردیتا ہے جو بہتی نہیں ہے ...... لَمَسَّكُمْ، یعنی تمہیں لگتا یا پہنچتا (عذاب)۔ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ، یعنی اُس چیز کی وجہ سے جو تم نے لی یا جو تم نے فدیہ میں حاصل کی۔

احکام القرآن للجصاص: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ ...... حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ...... اس کا ظاہر مقتضی یہ ہے کہ غنائم اور قیدی اِثخان کے بعد مباح ہیں ...... اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت (یعنی سورۂ محمد والی آیت) میں فرمایا ہے فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (جب کفار سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم انہیں خوب کچل لو تو قیدیوں کو باندھ لو)۔ اُس وقت پہلا فرض قتل تھا یہاں تک کہ مشرکین خوب کچل ڈالے جائیں۔ اس کے بعد فدیہ لینا مباح تھا، اور اِثخان سے پہلے فدیہ لینا جائز نہ تھا۔ آگے چل کر امام جصاص صحیح سند کے ساتھ حضرت عمرؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ سے مراد فدیہ لینا ہے۔

یہ اُن لوگوں کی تفسیریں ہیں جو عربیت کے بھی امام تھے اور آیاتِ قرآنی کے معنی و مفہوم کو سمجھنے میں بھی ممتاز

تھے۔ ان سب نے اِثخان فِی الارض کے وہی معنی بیان کیے ہیں جو آپ کے نزدیک مناسب نہیں ہیں۔ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ کو اُس اِمہال کے معنی میں نہیں لیا ہے جو آپ کے خیال میں کفار کے لیے سنّتِ الٰہیہ ہے۔ کسی نے بھی قریش کے اُس پروپیگنڈے کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے جس کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ یہ آیات اُس کے جواب میں نازل ہوئی تھیں۔ کسی کے نزدیک بھی پہلی آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اِثخان فی الارض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہ تھا۔ اور کسی نے بھی تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا سے لے کر عَذَابٌ عَظِیْمٌ تک سارے مضمون کا مخاطب کفارِ قریش کو نہیں قرار دیا۔ پھر آخر آپ کے پاس اِس بات کا کیا جواب ہے کہ عَذَابٌ عَظِیْمٌ کے بعد فوراً ہی فَکُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ جو ارشاد ہوا ہے وہ اُس معنی کے لحاظ سے جو آپ بیان کر رہے ہیں مضمونِ سابق کے ساتھ کیا مناسبت رکھتا ہے؟

۶- سورۂ زُخرُف، آیت ۶۱

"سورۃ الزخرف آیت ۶۱ کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے، اِس لیے کہ اِتّباع کا لفظ انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آیت کا صحیح ترجمہ ہوگا "اے نبی ان سے کہو وہ (حضرت عیسیٰؑ) تو قیامت کی نشانی ہے، پس اس میں شک نہ کرو اور میری اتباع کرو، یہ سیدھا راستہ ہے"۔"

اس آیت کی تفسیر میں مترجمین و مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ کسی نے پوری آیت کو اللہ تعالیٰ کا قول قرار دیا ہے اور کسی نے "اس میں شک نہ کرو" تک اللہ تعالیٰ کا قول اور "میرا اتباع کرو" سے آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار دیا ہے۔ پہلے مختلف تراجم ملاحظہ فرمایئے:

تفہیم القرآن: "اور وہ دراصل قیامت کی ایک نشانی ہے، پس تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مان لو، یہی سیدھا راستہ ہے"۔ (اس کی مفصل تشریح تفہیم القرآن، جلد چہارم صفحات ۵۴۲-۵۴۸ میں کی گئی ہے)۔

شاہ ولی اللہ صاحب: "وہر آئینہ عیسیٰ نشانہ است قیامت را، پس شبہہ مکنید در قیامت۔ و بگو یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیروی من کنید، این است راہ راست"۔

شاہ رفیع الدین صاحب: "اور تحقیق وہ البتہ علامت قیامت کی ہے، بس شک مت لاؤ ساتھ اس کے اور پیروی کرو میری، یہ ایک سیدھی راہ ہے"

شاہ عبدالقادر صاحب: "اور وہ نشان ہے اُس گھڑی کا، سو اس میں دھوکا نہ کرو اور میرا کہا مانو، یہ ایک سیدھی راہ ہے"

مولانا اشرف علی صاحب: "اور وہ (یعنی عیسیٰؑ) قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں، تو تم لوگ اس (کی صحت) میں شک مت کرو اور تم لوگ میرا اتباع کرو، یہ سیدھا راستہ ہے"

ان میں صرف شاہ ولی اللہ صاحب نے تصریح کی ہے کہ "پیروی من کنید این است راہ راست" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے فرمایا۔ اس کے بعد اب مفسرین کے اقوال ملاحظہ ہوں۔

ابن جریر کہتے ہیں: وَاتَّبِعُوْنِ اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ میری اطاعت کرو، جس بات کا میں حکم دوں اس پر عمل کرو اور جس چیز سے میں روک دوں اس سے رُک جاؤ۔ یہی بات زمخشری نے کہی ہے کہ وَاتَّبِعُوْنِ کا مطلب ہے میری پیروی کرو، یعنی میری ہدایت اور میری شرع اور میرے رسول کی پیروی کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہی تفسیر امام رازی، قاضی بیضاوی اور علامہ آلوسی نے کی ہے۔ ان سب نے وَاتَّبِعُوْنِ کے پہلے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ میری ہدایت اور میری شرع اور میرے رسول کی پیروی کرو۔ اور دوسرے معنی ان الفاظ کے ساتھ بیان کیے ہیں: "اور کہا گیا ہے" کہ یہ بات کہنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اتباع کا لفظ انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے۔

۷- الزُّخرُف، آیات ۸۵ تا ۸۹

"سورۃ الزُّخرُف ہی میں "وَقِیْلِہٖ" کا عطف شَہِدَ بالحق پر ہے۔ آیات کا مفہوم ہے:

"اُس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنھیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ کوئی علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔ اِن سے پوچھو دیکھو کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو یہ خود کہیں گے اللہ نے، پھر کہاں سے

اُلٹ جاتے ہیں وہاں بجو شہادت دے اپنے اس قول سے کہ اے رب، یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے۔
اچھا، اے نبیؐ اِن سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمہیں، عنقریب یہ جان لیں گے۔
یہ ایک پیچیدہ بحث ہے جس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پورا سلسلۂ کلام نگاہ میں رہے۔
آیت ۸۵ تا ۸۹ تک کی عبارت یہ ہے:

وَتَبٰرَكَ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ - وَلَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ - وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ - وَقِیْلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ - فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ۚ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ -

تفہیم القرآن میں ان آیات کی ترجمانی اس طرح کی گئی ہے: "بہت بالا و برتر ہے وہ جس کے قبضے میں زمین اور آسمانوں اور ہر اُس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اور وہی قیامت کی گھڑی کا علم رکھتا ہے، اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔ اُس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ کوئی علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر کہاں سے یہ دھوکا کھا رہے ہیں، قسم ہے رسولؐ کے اس قول کی کہ اے رب یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے۔ اچھا، اے نبیؐ، اِن سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔"

شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ یہ ہے: "و بسیار با برکت است آنکہ او راست بادشاہی آسمانہا و زمین و آنچہ درمیان ہر دو است۔ و نزدیک اوست علم قیامت و بسوئے وے رجوع کردہ شوید۔ و نمی توانند آنانکہ کفار پرستش می کنند بجز خدا شفاعت کردن، لیکن کسے کہ گواہی راست دادہ باشد و ایشان می دانند۔ و اگر سوال کنی از ایشان کہ کدام کس بیافرید ایشان را البتہ گویند خدا آفریدہ است۔ پس از کجا برگردانیدہ می شوند۔ و بسا دعائے پیغمبر کہ اے پروردگارِ من ہر آئینہ ایشاں گروہے ہستند کہ ایمان نمی آورند فرمودیم اعراض کن از ایشان و بگو سلامِ وداع، پس خواہند دانست۔"

شاہ رفیع الدین صاحب ان آیات کا ترجمہ یہ کرتے ہیں: "اور بہت برکت والا ہے وہ جو واسطے اُس

کے ہے بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ درمیان اُن کے ہے - اور نزدیک اُس کے ہے علم قیامت کا، اور طرف اُس کے پھیرے جاؤ گے - اور نہیں اختیار رکھتے وہ لوگ کہ پکارتے ہیں سوائے اُس کے شفاعت کرنا، مگر جو شخص گواہی دے ساتھ حق کے اور وہ جانتے ہیں - اور اگر پوچھے تو اُن سے کس نے پیدا کیا اُن کو، البتہ کہیں گے اللہ نے - پس کہاں سے پھیرے جاتے ہیں - اور بہت کہا کرتا ہے پیغمبر اے رب میرے تحقیق یہ قوم ہیں کہ نہیں ایمان لاتے - پس منہ پھیر لے ان سے اور کہہ سلامتی مانگتے ہیں شر تمہارے سے - پس البتہ جان لیویں گے"۔

شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ: "اور بڑی برکت ہے اُس کی جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جو اُن کے بیچ ہے - اور اُسی کے پاس ہے خبر قیامت کی اور اُسی تک پھیرے جاؤ گے - اور اختیار نہیں رکھتے جن کو یہ پکارتے ہیں سفارش کا، مگر جس نے گواہی دی سچی اور اُن کو خبر تھی - اور اگر تو ان سے پوچھے کہ ان کو کس نے بنایا تو کہیں گے اللہ نے - پھر کہاں سے اُلٹ جاتے ہیں، قسم ہے رسول کے اس کہنے کی کہ اے رب یہ لوگ ہیں کہ یقین نہیں لاتے - سو تو مُنہ پھیر اُن کی طرف سے اور کہہ سلام ہے - اب آخر کو معلوم کر لیں گے"۔

مولانا اشرف صاحب کا ترجمہ: "اور وہ ذات بڑی عالیشان ہے جس کے لیے آسمانوں و زمین کی اور جو مخلوق اُس کے درمیان میں ہے اُس کی سلطنت ثابت ہے - اور اُس کو قیامت کی (بھی) خبر ہے، اور تم سب اُسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے - اور خدا کے سوا جن معبودوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش (تک) کا اختیار نہیں رکھیں گے، ہاں، جن لوگوں نے حق بات (یعنی کلمۂ ایمان) کا اقرار کیا اور وہ تصدیق بھی کیا کرتے تھے - اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے - سو یہ لوگ کدھر اُلٹے چلے جاتے ہیں - اور اس کو رسول کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب یہ ایسے لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے - تو آپ ان سے بے رُخ رہیے اور یوں کہہ دیجیے کہ تم کو سلام کرتا ہوں - سو اُن کو ابھی معلوم ہو جاوے گا"۔

ان تراجم میں شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب نے وَقِيلِهِ کا عطف قریب کے فقرے سے مانا ہے - اس طرح شاہ ولی اللہ صاحب کے ترجمے کا سلسلۂ عبارت یوں بنتا ہے: "واگر سوال کنی از ایشاں ...... پس از کجا برگردانیدہ می شوند ؟ وبسا دعائے پیغمبر......" - اور شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمے کا سلسلۂ عبارت یوں بنتا ہے: "اور اگر پوچھے تو اُن سے ...... پس کہاں سے پھیرے جاتے ہیں؟

اور بہت کہا کرتا ہے پیغمبر.....“۔ مولانا اشرف علی صاحب نے وَقِيْلِهٖ کو وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ پر معطوف قرار دیا ہے اور اُن کے ترجمے کا سلسلۂ عبارت یہ بنتا ہے: ”اور اُس کو قیامت کی (بھی) خبر ہے اور اس کو رسول کے اِس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب.....“۔ معترض صاحب کہتے ہیں کہ وَقِيْلِهٖ کا عطف شَهِدَ بِالْحَقِّ پر ہے، اور قِيْلِهٖ کی ضمیر رسولؐ کے بجائے اُس شخص کی طرف پھرتی ہے جو علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔ اِس تجویز کے مطابق سلسلۂ عبارت یہ قرار پاتا ہے ”وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے اِلّا یہ کہ کوئی علم کی بنا پر حق کی شہادت دے اپنے اس قول سے کہ اے میرے رب.....“۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قِيْلِهٖ کی ضمیر کا مرجع ٹھیرایا ہے، مگر انھوں نے سیاقِ عبارت کو مسلسل ملتے ہوئے وَقِيْلِهٖ کو قسم قرار دیا ہے اور یہی طریقہ تفہیم القرآن کی ترجمانی میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اِس سے آیت ۸۸ کا مطلب آیات ۸۶، ۸۷ کے ساتھ مل کر یہ نکلتا ہے کہ ”قسم ہے رسولؐ کے اِس قول کی کہ اے میرے رب یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے، کیسی عجیب ہے اِن لوگوں کی فریب خوردگی کہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور پھر بھی خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی عبادت پر اصرار کیے جاتے ہیں“۔

مفسرین نے بھی اِن اختلافات کا اِسی طرح ذکر کیا ہے:

ابن جریر وَقِيْلِهٖ کا عطف وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ پر قرار دیتے ہیں اور معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور رسولؐ کے اُس قول کا علم بھی جو اپنے رب سے اپنی قوم کی تکذیب اور عدمِ ایمان کی شکایت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔ پھر ابن جریر قَتَادہ کی یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ قِيْلِهٖ سے مراد تمھارے نبیؐ کا قول ہے جو وہ اپنے رب سے شکایت کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں۔

زمخشری مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد زیادہ قوی اور موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ مناسب یہ سمجھتے ہیں کہ وَقِيْلِهٖ حرفِ قسم کے مُضمَر اور اس کے حذف پر مبنی ہو، اور یہ قول جوابِ قسم کے طور پر ہو کہ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ۔ گویا بات یوں ہوتی کہ ”میں قسم کھاتا ہوں رسول کے اِس قول کی کہ اے میرے رب یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے“۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ وَقِيْلِهٖ کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہوتی ہے، اور آپ کے قول کی قسم کھانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے مرتبے کی بلندی اور آپ کی دُعا و التجا کی اہمیت ظاہر کرنے کے سبب ہے۔

امام رازی، اَخفش اور فرّاء اور زجّاج کا قول نقل کرتے ہیں کہ وَقِیۡلِهٖ معطوف ہے السّاعۃ پر یعنی اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے اور رسولؐ کے اس قول کا علم بھی کہ یٰرَبِّ .... ۔

علامہ آلوسی وَقِیۡلِهٖ کا عطف السَّاعَةِ پر قرار دے کر وہی بات کہتے ہیں جو امام رازی نے نقل کی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میرے پاس رسولؐ کے اِس قول کا بھی علم ہے، کفار کے لیے دھمکی ہے (یعنی مراد یہ ہے کہ بادشاہِ کائنات اپنے سرکش بندوں سے کہہ رہا ہے کہ میں تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہوں جس کی بنا پر میرے رسولؐ نے تمہاری یہ شکایت مجھ سے کی ہے)۔ دوسرا قول انہوں نے وہی بیان کیا ہے جو اُوپر زمخشری سے نقل کیا گیا ہے۔ اور تیسرا قول انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ وَقِیۡلِهٖ میں واو قسم کا واو ہے، اور جوابِ قسم محذوف ہے (یعنی یہ بات اس میں مقدر ہے کہ ہم اپنے رسول کی مدد کریں گے یا کفار کے ساتھ جو معاملہ چاہیں گے کریں گے۔

بہرحال یہ بات ہماری نظر سے کسی تفسیر میں نہیں گذری کہ وقیلہ کا عطف اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ (اِلّا یہ کہ کوئی شخص علم کی بنا پر حق کی شہادت دے) پر ہے۔ کوئی مفسر جو قرآن کا فہم رکھتا ہو یہ بات کہہ بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ اُس فقرے پر معطوف قرار دے کر یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ "ہاں، جو شہادت دے کہ اے میرے رب یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے"۔ اِس لیے کہ آیت ۸۶ میں معبودانِ باطل کے لیے شفاعت کے اختیار کی نفی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "اِلّا یہ کہ کوئی شخص علم کی بنا پر حق کی شہادت دے" روزِ حشر سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ اُس روز شفاعت کے مجاز ہو سکیں گے۔ اس کے برعکس آیت ۸۸ میں یہ بات کہ "اے میرے رب یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے" اِسی دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ اِن دونوں فقروں میں آخر کیا مناسبت ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ شفاعت کا مجاز وہ شخص ہو سکتا ہے جو آخرت میں علم کی بنا پر حق کی شہادت دے اور دنیا میں اپنے اِس قول سے شہادت دے کہ اے میرے رب یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے؟

(بقیہ اشارات) کا ثمرہ ہے۔ پرستش خواہ معبودِ حقیقی کی ہو یا معبودانِ باطل کی، کسی روحانی جذبے کے زیرِ اثر ہی کی جاتی ہے۔ اِس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے غور کیجیے کہ تیسری دُنیا کے جذبۂ اتحاد میں روحانیت کا عنصر کس طرح فراہم ہوگا اور اُسے کون فراہم کرے گا؟ کیا چند معاشی مفادات کے بارے میں احساسِ محرومی اور میدانِ سیاست میں چند نَووارد افراد کی لاف زنی سے یہ رُوحانی خلا پُر ہوسکے گا؟

دُنیا کی دوسری قومیں اپنے اتحاد کے لیے جو نہج چاہیں اختیار کریں، مگر مسلمانوں کے لیے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک ہی راہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لیے مستقل صورت میں متعین کر دیا ہے۔ اگر وہ اُس راہ پہ گامزن ہوں تو اُن کے سارے مسائل خود بخود نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہوتے چلے جائیں گے اور اُنھیں کسی مرحلہ پر بھی ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ اِس اتحاد کے معاملہ میں بھی اُن کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ تیسری دُنیا اور چوتھی دُنیا کو معاشی مفادات کی بنیاد پر جمع کرنے کے خیالِ خام کو چھوڑ کر ملّتِ اسلامیہ کے منتشر عناصر کو اسلام کی اساس پہ مجتمع کرنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کے تحت الشعور میں ایک الگ اُمت ہونے کا احساس پوری طرح موجود ہے۔ اگر اِس احساس کو بیدار کر دیا جائے تو یہ ملّت ایک نئی اخلاقی اور روحانی قوت بن کر نہ صرف دنیا سے ظلم و استبداد کا خاتمہ کرسکتی ہے بلکہ اِس کرۂ ارضی پر بسنے والی مختلف قوموں کے مابین صلح و آشتی قائم کر کے اسے امن و امان کا گہوارہ بھی بنا سکتی ہے۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

[illegible] نے قرآن حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ
[illegible] کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادھا مفہوم
[illegible] ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

جو حضرات پیشگی روپے روانہ کر دیں گے انہیں یہ مترجم و محشّی قرآن مجید
رقوم کی ترسیل کے مطابق ترتیب وار بھیجا جائے گا

ہدیہ قسم اعلیٰ	۷۵/- روپے
ہدیہ قسم دوم	۶۰/- روپے

پیشگی [illegible] کرنے والے حضرات سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا

ناظم ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور

[illegible] فون نمبر: ۴۱۱۰۱۴ —————— ۴۱۱۰۱۶